جلد 5 شمارہ 4 جون 2003ء ربیع الثانی 1424ھ

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی ۝ وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی ۝ (الاعلیٰ 14-15)

بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا

اللہ

محبت

صداقت

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پرواز مسلسل

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح وفلاح کا علمبردار

ماہنامہ

فلاحِ آدمیت

گوجرانوالہ

CPL No. 491

Registerd

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

اغراض و مقاصد

- کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے مطابق خالص توحید، اتباع رسول ﷺ ، کثرت ذکر، مکارم اخلاق اور خدمت خلق پر مشتمل حقیقی اسلامی تصوف کی تعلیم کو فروغ دینا۔
- کشف وکرامات کی بجائے اللہ تعالی کے قرب وعرفان اور اسکی رضا ولقاء کے حصول کو مقصود حیات بنانے کا ذوق بیدار کرنا۔
- حضور ﷺ کے صحابہ کی پیروی میں تمام فرائض منصبی اور حقوق العباد ادا کرتے ہوئے روحانی کمالات حاصل کرنے کے طریقہ کی ترویج۔

موجودہ زمانے کی مشغول زندگی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت ہی مختصر اور سہل العمل اورادو اذکار کی تلقین۔

- غصہ ونفرت، حسد و بغض، تجسس وغیبت اور ہوا و ہوس جیسی برائیوں کو ترک کر کے قطع ماسواء اللہ، تسلیم ورضا، عالمگیر محبت اور صداقت اختیار کرنے کو ریاضت اور مجاہدے کی بنیاد بنانا۔
- فرقہ واریت، مسلکی اختلافات اور لاحاصل بحثوں سے نجات دلانا، تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی اہمیت کا احساس پیدا کر کے اپنی ذات، اہل وعیال اور احباب کی اصلاح کی فکر بیدار کرنا۔
- اللہ تعالی کی رضا، اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی اور ملت اسلامیہ کی بہتری کی نیت سے دعوت الی اللہ اور اصلاح و خدمت کے کام کو آگے بڑھانا۔ اپنے مسلمان بھائیوں کے دلوں میں قلبی فیض کے ذریعے اللہ تعالی کی محبت بیدار کرنا اور روحانی توجہ سے انکے اخلاق کی اصلاح کرنا۔

عالمگیر محبت، اکرام انسانیت اور فلاح آدمیت کا علمبردار

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

بیادگار خواجہ عبدالحکیم انصاری رح
بانی سلسلہ

ماہنامہ گوجرانوالہ

فلاح آدمیت

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

نگران و سرپرست
محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب
شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

جلد 5 شمارہ 4 جون 2003ء جمادی الثانی 1424ھ

ایڈیٹر وحید احمد

قیمت ——— -/15 روپے　　سالانہ فنڈ ——— -/150 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:
محمد صدیق ڈار توحیدی
مرکز تعمیر ملت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph:0431-893535

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:
وحید احمد
تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
Ph:0431-293379

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-431-222020
E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

اداریہ

اللہ تعالیٰ کے رسول جو بھی حکم تمہارے پاس لے کر آئیں تم اس کو لو اور قبول کرو اور جس چیز سے وہ تم کو منع فرمائیں تو تم اس سے باز آجاؤ اور رک جاؤ۔ (القرآن)

آپ اگر آج کے مسلم معاشرے پر نظر ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی غالب اکثریت اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ وہ یہود و نصاریٰ اور دوسری غیر مسلم اقوام کی پیروی میں اس قدر پیش پیش ہیں کہ سوائے چند ظاہری رسموں کے ان میں اور غیروں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ہر جگہ مسلمان اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ نام مسلمانوں جیسا رکھ لیا جائے ولادت و وفات کا طریقہ مسلمانوں کی طرح اختیار کر لیا جائے یعنی پیدائش کے وقت بچے کے دائیں کان میں اذان، بائیں کان میں تکبیر پڑھ دی جائے، ختنہ کرا دی جائے اور موت کے وقت غسل دے کر کفن پہنا کر نماز ادا کر کے دفن کر دیا جائے اور نکاح پڑھوا کر رشتہ ازدواج قائم کر دیا جائے، بس مسلمان ہونے کے لئے اتنا کافی ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام بھی کرتے ہیں اور اسلام کے ارکان بجا لاتے ہیں اگرچہ ان میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو صرف عیدین یا جمعہ کا اہتمام کرتے ہیں مگر روزانہ پانچ وقت کی نماز نہیں پڑھتے اور ایسے بھی ہیں کہ نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں لیکن زکوٰۃ اور حج کو ضروری نہیں سمجھتے حالانکہ ان کے پاس اتنا مال ہوتا ہے کہ وہ زکوٰۃ دیں اور حج کریں۔ بہت سے روزہ سے جان چراتے ہیں اور روزہ نہیں رکھتے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا پورے طور سے یا ناقص طریقہ پر خیال رکھنے والوں نے بس اسلام کے لئے اسی کو کافی سمجھ لیا ہے۔ انہیں کبھی خیال نہیں آتا کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ عقائد اور عبادات کی کی طرح انتہائی ضروری ہے کہ رہن سہن کے طور طریقے بھی اسلامی ہونے چاہیں۔ معاملات اور کاروبار کی ہر شکل کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا ضروری ہے۔ اخلاق کی تربیت بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق لازمی ہے آج ہماری بود و باش کا طریقہ قطعاً غیر اسلامی ہو گیا ہے۔ لباس میں یہود و نصاریٰ کی نقل فخر کا باعث بنی ہوئی ہے۔ سر سے پاؤں تک ایک مسلمان ایسے لباس میں ملبوس نظر آتا ہے جو کفار و فساق کا شعار ہے، عورتوں میں عریانی اور بے حیائی کے مظاہر اس قدر عام ہیں کہ ایک شریف اور باحیاء انسان کی نظریں شرم و غیرت سے جھک جاتی ہیں۔ گانے

بجانے کا شغل عام ہوگیا ہے۔ یہ حیاء سوز حرکتیں آج فیشن کا لازمی جزو بنی ہوئی ہیں۔ کاروبار میں جھوٹ فریب، دھوکہ اور لوٹ مار روزمرہ کا دستور بنے ہوئے ہیں۔ سود اور جوئے کو برائی اور گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔ حرام کی حرص زیادہ سے زیادہ ہوتی جارہی ہے۔ بغض وحسد، ریاکاری اور منافقت کا چلن اتنا ہے کہ کوئی بھی پاک نظر نہیں آتا۔ یہ سب اس لئے ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی اتباع اور ان کی تعلیمات کی پیروی چھوڑ دی ہے، حالانکہ جس خسارے اور نقصان سے آج ہماری قوم دوچار ہے اگر اس کا صحیح صحیح جائزہ لے کر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ احکام اسلام سے روگردانی ہی ہماری بیمار قوم کا اصل مرض ہے اور اس کا علاج صرف دامن رسالت ﷺ سے وابستگی ہے اور کچھ نہیں۔

دنیا نے آپ کے دامن سے وابستہ رہ کر کامیاب زندگی کا تجربہ کیا ہے آج کے جدید دور کے تقاضوں کے پیش نظر بھی کامیابی حاصل کرنے کے لئے اسی دامن سے وابستگی شرط اول ہے۔ یہ فریب اور دھوکہ ہے کہ آج کے تقاضے اور ہیں اور چودہ سو سال پہلے کی تعلیمات آج کارگر اور مفید نہیں ہے۔ صداقت خلوص اور اللہ تعالیٰ کی اسی رسی کو مضبوط پکڑنے اور اسلامی احکام کی پیروی کرنے کی قیمت اور اہمیت لازوال ہے۔ یہ سکے وقت گزرنے کے ساتھ پرانے نہیں ہوتے بلکہ ان کی عظمت کو چار چاند لگتے ہیں۔ زمانہ آج بھی پکار پکار کر ان کی عبقریت کی گواہی دے رہا ہے۔ پوری دنیا آج انسانوں کے نامعقول اور نامکمل دساتیر کی زبوں حالی کی پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے اور زبان حال سے اللہ تعالیٰ کے قانون ودستور کی عظمت واہمیت کی تائید کر رہی ہے۔

کاش! مسلمان اس متاع گم گشتہ کو پھر از سر نو سنبھال لیں اور تعلیمات پیغمبر پر عمل پیرا ہوں تو اس میں اس کا بھی بھلا ہے اور پوری انسانیت کا بھی۔

والسلام! وحید احمد

سب سے بڑی نعمت

(ماجد محمود توحیدی)

"پھر تم سے اس دن ہر نعمت کے بارے میں سوال کیا جائے گا!" (التکاثر)

اللہ تعالیٰ کی انسان پر بے پایاں عنایات ہیں اللہ تعالیٰ کی بہت زیادہ شفقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صراط مستقیم سے روشناس کروانے کے لئے اپنی محبوب ترین شخصیات دنیا میں بھیجیں ورنہ اللہ کی ربوبیت والوہیت اور اپنی عبدیت کا اقرار تو انسان روز ازل ہی سے عالم ارواح میں اللہ کے سامنے کر چکا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے یاددہانی کے لئے اپنے رسول بھیجے تاکہ انسان غفلت و بے خبری میں رہ کر کہیں دوزخ میں نہ چلا جائے بلکہ صراط مستقیم پر چل کر جنت کا وارث بن جائے۔

ہماری بہت بڑی خوش قسمتی اور اللہ کی بہت بڑی مہربانی کہ اللہ نے ہم کو اپنے محبوب ترین بندے، ثمرہ کائنات، سید الانبیاء، رحمت اللعالمین کی امت میں پیدا فرمایا۔

انسان پر اللہ کی کروڑہا نعمتیں ہیں جن کا شمار ہی نہ تو انسان کے بس میں ہے نہ ہی انسان ان کا شکریہ ادا کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ رحمٰن میں انسان کے شعور میں اپنی نعمتوں کا احساس پیدا کرنے کے لئے جابجا یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ

"تم اپنے رب کی کون کونسی نعمت کو جھٹلاؤ گے"

نعمتوں کے شکر کے حوالے سے اللہ نے سورۃ کہف کی آخری آیت میں یوں ارشاد فرمایا۔

"آپ فرما دیں کہ اگر تمام دریا سیاہی بن جائیں اور تمام انسان میری تعریف لکھنے بیٹھیں تو یہ دریا ختم ہو جائیں اتنے دریا اور آ جائیں تو بھی میری تعریف نہیں لکھ سکتے"

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اتنا نوازنے کے باوجود احسان نہیں جتلایا۔ اب ہم اس نعمت کی طرف آتے ہیں جو سب نعمتوں سے افضل و اعلیٰ اور معتبر ہے کہ جس کا احسان جتلائے بغیر اللہ تعالیٰ نہیں رہ سکے وہ نعمت ہے اللہ کے آخری رسول حضرت محمد مصطفےٰ:

اللہ تعالیٰ قرآن میں ارشاد فرماتے ہیں،

"البتہ تحقیق ہم نے مومنوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں اپنا رسول بھیجا"

اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ ؐ کا مقدس فریضہ بھی ارشاد فرمادیا کہ :

"آپ ان پر میری نشانیاں تلاوت کرتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے"

اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ ہم کو مکمل ترین ضابطہ حیات اور سید الانبیاء ؐ کی امت میں پیدا فرمایا ہے۔

جس کلاس کو کامل ترین استاد مل جائے اور جس کلاس کا نصاب بھی ہر قسم کے نقائص سے مبرا ہو اور مکمل ترین ہو۔ اس کلاس کا نتیجہ لازمی طور پر سو فیصد ہونا چاہیے۔ آج ہم اپنی طرف دیکھیں تو ہمارا (امت مسلمہ کا) حال بہت ہی برا ہے۔ جو کہ صرف ہماری بے عملی اور نالائقی کا ثبوت ہے۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے حضور اکرم ؐ کے لائے ہوئے پیغام کو اپنا نصب العین بنایا تو بڑی سرعت سے دنیا پر چھا گئے۔ اور دنیا کی امامت ان کے ہاتھ آ گئی۔ جونہی ہم نے اس تعلیم سے ناطہ توڑا ہم نیچے لڑھکنا شروع ہو گئے۔

ہر سال **12** ربیع الاول کے مہینے میں حضور اکرم کی آمد کی خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ مقررین حضرات شان رسالت ؐ پر تقاریر کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ضرور ہونا چاہیے۔ کیوں نہ ہو آخر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سمیٹ کر انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیج دی۔ لیکن ان مجالس میں حضور اکرم ؐ کے لائے ہوئے مشن کی بات کم ہوتی ہے۔ جو ابھی تک تشنہ تکمیل ہے۔ جس کی تکمیل امت وسطہ کے ہاتھوں ہونی ہے۔ اور وہ مشن اللہ کے رسول ؐ کے لائے ہوئے پیغام رحمت کو ساری دنیا تک پہنچانا ہے۔ دنیا کو اس راہ کی طرف بلانا بھی ہے اور عملی زندگی سے اس کا نمونہ بھی دکھانا ہے۔

حضور اکرم ؐ نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا اور صحابہ اکرامؓ سے سوال کیا! کیا میں نے اللہ کا پیغام آپ تک پہنچا دیا ہے۔ سب نے عرض کی یا رسول اللہ ہاں آپ نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا ہے۔ آپ نے فرمایا! اے اللہ گواہ رہنا۔ اس کے بعد جلد ہی قرآن کریم کا نزول اختتام کو پہنچا۔ چونکہ حضور ؐ نے اللہ کے دین کو لوگوں تک پہنچانے اور اسے عملی طور پر نافذ کرنے کا حق ادا کر دیا اس لئے اللہ نے اپنے حبیب کو اپنے پاس بلا لیا۔ حضور اکرم ؐ کے بعد یہ ہماری ذمہ داری تھی کہ پوری دنیا تک اللہ کی رحمت کا پیغام ہم نے پہنچانا تھا۔ جب تک مسلمان متحرک رہے یہ فرض پورا ہوتا رہا۔ لیکن اب دوسرے فرائض کی طرح یہ فرض بھی پورا نہیں ہو رہا۔ ہم خود ہی

اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ دوسروں کو روشنیوں کا ہمسفر کیسے بنائیں گے۔ ہم نے انسانیت کو اللہ کا راستہ بتانا تھا لیکن ہم خود ہی اللہ سے دوری کا شکار ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہم سے روٹھے ہوئے ہیں۔

آج جو قومیں غیر مسلم ہیں اور کفر وضلالت میں پڑ کر جانوروں سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہی ہیں۔ کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ اس میں کچھ ہمارا بھی قصور ہے۔ کیا ہمارا یہ فرض نہیں کہ ان کے سامنے حقیقت کو واضح کریں۔ اسلام جیسے فطرتی دین کی روشنی سے روشناس کروائیں۔ ان حالات میں علمائے دین کا فرض ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات ڈالیں کہ امت مسلمہ کا دنیا میں کیا کردار ہے۔ کیوں اسے "خیر الامت" کا خطاب دیا گیا ہے۔ کیوں اس امت میں شامل ہونے کے لئے سابقہ انبیاء اللہ تعالیٰ سے دعائیں فرماتے رہے یاد رکھنا چاہیے کسی بھی چیز یا شخص کی اہمیت وفضیلت اس کے کردار وخوبی کی وجہ سے ہوتی ہے اور جب اس کی یہ کردار وخوبی جاتی رہتی ہے تو اس کی شان وشوکت بھی جاتی رہتی ہے۔

کل قیامت کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے سامنے کونسا منہ لیکر جائیں گے کہ انبیاء کے تاجدار کی رہنمائی اور اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب کی ہدایت کے باوجود ہم اللہ سے منہ موڑ کر دنیا کی لذات میں کھو گئے۔

اس لئے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو حضور اکرمؐ کی تعلیمات کے مطابق ڈھالیں۔ اپنے اخلاق وکردار کو قرآن کے مطابق بنائیں تاکہ نہ صرف اسلامی معاشرہ اللہ کے دین کے ثمرات سے مستفید ہو بلکہ ساری دنیا ان ثمرات کو دیکھے اور ان سے فائدہ اٹھائے کیونکہ اسلام کا پیغام سب کے لئے ہے۔

اس لئے ہمیں اپنے عمل سے ثابت کرنا ہے کہ ہمارے رسولؐ ہی اللہ کے آخری رسولؐ اور قرآن تمام انسانوں کے لئے مکمل ترین ضابطہ حیات ہے۔ جس پر چل کر ہم دنیا میں بھی پھل پھول سکتے ہیں اور اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں اور آخرت میں بھی اللہ کی رضا اور اعلیٰ ترین نعمتوں کے حقدار بن سکتے ہیں۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم حضور اکرمؐ کی آنکھوں کی ٹھنڈک و فرحت کا سبب بن سکتے ہیں۔

اللہ کی نصرتیں تو آج بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ صرف ہمارے مومن بننے کی دیر ہے۔ اپنی

اصلاح کرنے کی دیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو" مومن کی صفات جاننے کے لئے قرآن کریم کا مطالعہ کریں۔ اور اس کی عملی زندگی کی جھلک دیکھنی ہو تو حضور نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ اور آپؐ کے صحابہ اکرامؓ کی زندگی سے مکمل رہنمائی مل جائے گی۔ اس لئے اگر ہم اللہ کے لئے میدان میں نکل پڑیں تو اللہ کی رحمت ہمیں تنہا نہیں چھوڑے گی اور فرشتے آج بھی ہماری نصرت کو اتر سکتے ہیں:۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

شرط صرف مومن کی ہے اس معیار تک پہنچنے کی ہے جہاں اللہ ہمیں دیکھنا چاہتے ہیں ورنہ ہم منجدھار میں پھنسے اور طوفانوں میں گھرے رہیں گے اور لہریں ہمیں ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر پٹختیں رہیں گی ہمیں حالات کو قابو میں کرنا ہے اور طوفانوں کا رخ موڑنا ہے۔ یہ کام ہر مومن کو فرداً فرداً بھی کرنا ہے اور آج ہی سے کرنا ہے اور پھر اسے محبت سے پوری ملت تک پھیلانا ہے۔ جب تک یہ نہ ہوگا حالات نہیں بدلیں گے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ہے کہ ہم کو سچے اور پکے مومن بنائے۔ سیاسی اور مسلکی اختلافات کو ختم کرے صرف مسلم بننے کی توفیق دے۔ دنیا کی محبت دور کرے اپنی اور اپنے حبیبؐ کی محبت ہمارے دلوں میں بسا دے۔ صحیح معنوں میں حضورؐ کا امتی اور غلام بنائے اور قیامت کے دن اپنے اور اپنے حبیبؐ کے سامنے شرمسار ہونے سے بچا کر سرخرو فرمائے۔ آمین

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆

خواجہؒ کے خطوط

(خالد مسعود توحیدی)

1-اللہ واقف ہے

(بنام محمد صدیق ڈار صاحب 20-7-1962)

" ملک سے باہر جانا ہو تو جتنا وقت ملے اللہ اللہ کر لیا کرو۔ اللہ واقف ہے کہ کوئی بندہ مجبوری سے اللہ اللہ نہیں کر سکتا تو وہ معاف کر دیتا ہے۔ "

2-اللہ کا حکم

(بنام محمد صدیق ڈار صاحب 13-1-1963)

" رہا بخار تو وہ دوسری بات ہے۔ اس کا تعلق اللہ سے ہے اور اللہ کا حکم تو ماننا ہی چاہیے۔ ورنہ وہ اچھے بندوں سے اپنا حکم مجبوراً منواتا ہے۔ "

3-روزانہ کا ذکر

(بنام محمد صدیق ڈار صاحب 20-1-1964)

" مرزا صاحب کو کیا اور سب کو بھی اپنا الگ ذکر ضرور کرنا چاہیے۔ یہ انہوں نے کیا کہا کہ میرا حلقہ ذکر سے کچھ نہیں بنتا۔ انہوں نے نماز بھی چھوڑی ہوئی ہے۔ دوسرے لوگوں کو بھی بتاتے رہیں کہ حلقہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ لوگ اکیلے اکیلے روزانہ کا ذکر نہ کریں۔ وہ تو بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کچھ بھی نہیں بن سکتا۔ "

4-دنیاوی خیالات

(بنام اکبر مغل صاحب 30-11-1971)

" دنیاوی خیالت اس قدر جلدی تو نہیں جا سکتے۔ نفی اثبات زیادہ کر دو اور سوتے وقت دماغ کو خالی (Vacant) کر کے سویا کرو۔ "

5-پانچ منٹ تنہائی میں

(بنام غوث محمد صاحب 21-6-1974)

" رات کو سب کاموں سے فارغ ہو کر دس پانچ منٹ بالکل تنہائی میں سب کچھ نفی کر کے پاس انفاس کر و اور ساتھ ہی میرا خیال کرو۔ اور بھائیوں کو بھی یہ بات بتا دو۔ "

6- مقصد قلب کی صفائی ہے

(بنام اکبر مغل صاحب 29-9-1971)

"دوسروں کے آرام میں مخل ہونے کی بجائے آپ آہستہ سے ذکر کرلیا کریں۔ مقصد قلب کی صفائی ہے کسی کو تنگ کرنا نہیں۔ نفی اثبات تقریباً بیس منٹ تک بہت آہستہ آواز سے کرلیا کریں۔ پاس انفاس سے بھی غفلت نہ کریں۔"

7- درود شریف کا ورد

(بنام اکبر مغل صاحب 29-9-1971)

"ہر نماز کے بعد 200 مرتبہ درود شریف " **صلى الله عليك يا رسول الله**" پڑھا کریں۔ یعنی چوبیس گھنٹے میں ایک ہزار مرتبہ۔"

8- اللہ کی مدد

(بنام انصار حسین صاحب 13-6-1973)

"(اگر تحریر نہیں لکھی گئی) ورنہ چار پنچوں سے فیصلہ کرالیا جائے۔ اس عرصہ میں آپ کا بھائی یہ پڑھتا رہے۔" **ربی انی مغلوب فانتصر**"

9- افسروں کے سامنے

(بنام محمد مرتضیٰ صاحب 26-3-1976)

"اقبال صاحب سے کہیں کہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے "**یا عزیز العظیم**" پڑھتے رہا کریں اور جب افسروں کے سامنے جائیں تو یہ خیال کریں کہ میں ان کے ہمراہ ہوں اور خوف وغیرہ یا ناامیدی بالکل نہ ہونے دیں۔"

10- کچھ بھی پڑھ کر دم کریں

(بنام محمد صدیق ڈار صاحب 15-1-1966)

"بیٹی کی بیماری کا پڑھ کر فکر ہوا۔ اللہ تعالیٰ صحت دے گا۔ آپ کچھ بھی پڑھ کر پانی دم کر کے روزانہ پلا دیا کریں۔ بہتر تو یہ ہے کہ سورۃ یٰسین پڑھ دیا کریں۔"

☆☆☆☆☆

صوفیاء کا کردار

(محمد شفیق خاں)

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء فرمایا کرتے تھے کہ مجھے خواب میں ایک کتاب دی گئی جس میں لکھا تھا کہ جہاں تک ہو سکے دلوں کو راحت پہنچاؤ کیونکہ مومن کا دل اسرار الٰہی کا محل ہے۔ نیز فرمایا کہ قیامت کے بازار میں کوئی اسباب اس قدر قیمتی نہ ہوگا جس قدر دلوں کو راحت پہنچانا۔ ایک مشہور قول ہے:

"برا کہنا بے شک برا ہے مگر برا چاہنا اس سے بھی برا ہے۔"

اسلام کی جو پاکیزہ تعلیمات کتابوں میں درج ہیں اور مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ صوفیاء نے اپنی خانقاہوں میں ان پر عمل کر کے دنیا کو دکھلایا۔ اور دلوں کو راسخ کرلیا۔ جب فقہا منطقی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے اور امت کو فرقوں میں تقسیم کر رہے تھے تو اس وقت صوفیوں نے ہی مسلمانوں کو توحید اور یک نگاہی کا درس دیا۔ ہم ان کے کردار کی چند خوبیوں کا جائزہ لیتے ہیں جو مسلم معاشرے کی بقاء کی ضامن بنیں۔

صوفیاء نے ہر زمانے میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو زندہ رکھا صوفیاء سے بڑھ کر تبلیغ اور تعمیر سیرت کا فریضہ کسی جماعت نے سرانجام نہیں دیا صوفیاء نے بادشاہوں کے سامنے علی الاعلان کلمہ حق کیا۔

جب مسلمانوں میں عقلیت کا مذاق پیدا ہوا اور انہوں نے قرآن کو اپنی عقل کے تابع بنانا شروع کیا تو صوفیوں نے محبت الٰہی کا درس دے کر عقلیت کے مضر نتائج کا ازالہ کیا۔

جب فقہاء نے دین کے ظہور پر زور دیا تو صوفیاء نے باطنی اصلاح اور قلبی طہارت کا درس دے کر قوم کو اعتدال کی راہ دکھائی۔

صوفیاء نے ہر دور میں غیر اسلامی عقائد، شرک اور بدعت کی تردید کی، سرمایہ داری کے مقابلے میں انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت واضح کی، بادشاہوں کو دنیاداری کی تلقین کی۔

جب فقہاء مسلمانوں کو آپس میں لڑا رہے تھے اس نازک دور میں صوفیوں نے ان کو محبت اور ہمدردی کا درس دیا۔

فقہاء اور متکلمین نے مسلمانوں کو کافر بنایا مگر صوفیائے کرام نے انہیں اپنی پاکیزہ زندگیوں

سے مسلمان بنایا۔

فقہاء اور متکلمین نے مسلمانوں میں گروہی انتشار پیدا کیا جبکہ صوفیاء نے مسلمانوں کو جام وحدت پلا کر بکھرا ہوا شیرازہ سمیٹ دیا۔

علماء اور فقہاء بادشاہوں کا قرب حاصل کرتے رہے۔ جبکہ صوفیاء بادشاہی سے الگ تھلگ رہ کر ملوکیت کے خلاف بولتے رہے۔

جب علماء بادشاہوں کو خوش کرنے کے لئے تاویلات میں مصروف تھے اس وقت صوفیاء بادشاہوں کو خوف خدا کا درس دے رہے تھے۔

علماء اور فقہاء نے اپنا وقت ذات وصفات کی بحثوں میں گزارا جبکہ صوفیاء نے کہا کہ خدا کے باب میں یہ بحث ہی فضول ہے۔ خدا منطق کے ذریعے نہیں مل سکتا، آئینہ قلب کو صاف کرو اسکا خود بخود دیدار ہو جائے گا۔

علماء نے دینی کتابیں لکھیں جبکہ صوفیاء نے وہ آدمی تیار کئے جنہوں نے ان کتابوں کے احکام پر عمل کر کے انقلاب برپا کر دیا۔

علماء نے لوگوں کے صرف دماغوں کی آبیاری کی جبکہ صوفیاء نے دماغ کے ساتھ ساتھ دلوں کی تربیت اور اصلاح کا فریضہ بھی سرانجام دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ انسان کے جسم میں ایک خون کا لوتھڑا ہے۔ جس کا نام دل ہے اگر یہ صحیح ہو گیا تو سارا جسم صحیح ہو گیا۔

علماء نے دلیلوں کے ذریعے اسلام کی حقانیت کو واضح کیا جبکہ صوفیاء نے مشاہدہ باطنی کے ذریعے اسلام کی صداقت واضح کی۔

☆☆☆☆

زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ

(محمد موسیٰ بھٹو)

آج ہمارے معاشرہ میں علم سے زیادہ عمل کی کمی ہے۔ دینی اور مذہبی علم کے اعتبار سے ہمارے ہاں بڑے بڑے عالم، فاضل، مفسر قرآن اور خطیب موجود ہیں۔ جن کی تقریروں اور تحریروں سے ان کے علم و فضل کی دھاک بیٹھ جاتی ہے۔ اور ذہن مرعوب و مسحور ہو جاتے ہیں لیکن چونکہ علم کے ساتھ مربیوں اور مزکیوں سے بے اعتنائی کی کیفیت ہے اس لئے ایسا علم معاشرہ میں مسلمانوں کے افتراق، دھڑے بندی اور ایک دوسرے کی تردید و تکفیر کا ذریعہ بن گیا ہے۔ بالعموم جو جتنا بڑا عالم و دانشور ہے اس کے مزاج میں اتنی زیادہ سختی، تشدد، اپنی بڑائی و عظمت اور دوسروں کو غلط سمجھنے کا رجحان اور کدورت موجود ہے۔ اس چیز نے مسلمانوں کی صفوں میں گہرے شگاف پیدا کر دیئے ہیں اور ان کی قوت کو مفلوج بنا کر دکھ دیا ہے۔ یہ صورت بتاتی ہے کہ ہمیں ایسی باطنی اصلاح اور روحانی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ جس سے ہمارے قلب و جگر میں سوز و گداز نرمی اور عجز و انکساری پیدا ہو اور اسلام اور مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے لئے مزاجی رکاوٹیں اور نفسی حجاب دور ہو جائیں۔ یہ کام تہذیب نفس اور ضبط نفس سے تعلق رکھتا ہے۔ جو بہر حال مزکی و مربی کے زیر اثر محبت سے ہی بہتر طور پر سرانجام دیا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک دین کا کام کرنے والے افراد اور جماعتیں دین کے باطنی پہلو کی طرف توجہ نہیں دیں گی اور ان پر اس کی اہمیت واضح نہ ہوگی تب تک دین کے نام سے ہونے والے تمام کاموں کی حیثیت بے جان ڈھانچہ سے زیادہ نہ ہوگی کہ جسے سجا کر تو پیش کیا جا سکتا ہے لیکن متحرک اور فعال نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح کے کاموں سے بڑے بڑے اجتماعات، جلسے وغیرہ جس سے دین کی شان و شوکت ظاہر ہوتی ہو وہ تو ہو جاتے ہیں۔ لیکن عوام میں بالفعل دینی تحریک اور دینی روح پیدا نہیں ہو سکتا۔

اسلام کے حوالہ سے لفظ تحریک بھی آج کل بہت استعمال ہو رہا ہے۔ تحریک خارجی زندگی میں شان وشوکت کے مظاہرہ ہی کا نام نہیں ہے بلکہ تحریک عملاً سب سے پہلے قلب میں برپا ہوتی ہے۔ تحریک وہ ہے جو فرد کو خدا کے حکموں کی ادائیگی کے لئے بے چین کر دے۔ جس شخص کے اندر تحریک ہوگی اسے نماز کی ادائیگی یا دوسرے خدائی حکموں کی ادائیگی کے بغیر چین نہ آئے گا جبکہ تحریک سے محروم شخص نماز پڑھے بغیر آرام سے سو جائے گا۔ وہ اسلام کے ظاہری اور نمائشی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے گا لیکن جن خدائی احکام میں نفس مٹتا ہو، ایثار و قربانی کا مظاہرہ ہوتا ہوا اپنے آپ کو فنا کرنا پڑتا ہو۔ ایسے کاموں

سے اسے چنداں دلچسپی نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر مضر سے بچنے اور منفعت کے حصول کے لئے قوت محرک رکھی ہے۔ اس قوت محرکہ کو استعمال کرنے کا نام ہی تحریک ہے مثال کے طور پر اگر سانپ گھر میں داخل ہو جائے تو بے چینی موجود رہے گی یہ بے چینی دو صورتوں میں ختم ہوگی۔ یا تو سانپ مارا جائے یا آنکھوں سے دیکھ لیا جائے کہ سانپ گھر سے نکل گیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کے گھر میں منکر موجود ہے تو تحریک کا حامل فرد اس وقت تک مضطرب رہے گا جب تک اس منکر کو گھر سے نکال نہ دے۔ اگرچہ منکر اس کے سامنے نہ ہوتا ہو لیکن اسے معلوم ہو کہ منکر اس کے گھر میں داخل ہو گیا ہے۔ دونوں صورتوں میں مضطرب ہوگا۔

اس طرح کی تحریک بہر حال تزکیہ و تربیت، قرآن سے اپنا تعلق مستحکم کرنے اور مزکی کی صحبت کے بغیر حاصل ہونا دشوار ہے۔ اس لئے کہ انسان عقل سے مضر و منفعت کو پہچان تو لیتا ہے لیکن جذبات میں تحریک اور اضطراب تزکیہ سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

جس طرح ماہر ڈاکٹر یا حکیم انسان کے جسمانی امراض کا گہرا ادراک رکھتا ہے اور اس کا بہتر طور پر علاج کرتا ہے اسی طرح مربی و مزکی فرد کی نفسی کمزوریوں کے طویل اور گہرے مشاہدہ کے بعد بیماری کی مناسبت سے علاج کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں میں نام لئے بغیر کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں۔ یہ مثالیں اتفاقی نوعیت کی نہیں ہیں بلکہ ہر مربی و مزکی کو افراد کی تربیت کے دوران پیش آتی رہتی ہیں اور اکثر و بیشتر افراد اپنی روزمرہ زندگی میں اس طرح کی بیماریوں سے دوچار ہوتے ہیں۔

ایک مربی کا واقعہ ہے کہ اس کے زیر تربیت ایک بہت بڑے عالم دین ہیں جو ایک شہر میں وہاں کی جامع مسجد کے خطیب ہیں۔ ان کی خطابت کے جواہر اتنے کھل چکے ہیں کہ لوگ ان کی تقریر سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ اس سے خطیب صاحب کو اپنے بارے میں غلط فہمی پیدا ہونا شروع ہوتی ہے وہ تقریر تو کرتا ہے جس سے دین کی خدمت بھی ہوتی ہے لیکن اس کا ضمیر مطمئن نہیں ہے۔ اس کا اندر کا انسان بہت طاقت ور ہو گیا ہے۔ جو چاہتا ہے کہ لوگ بس مسلسل اس کی خطابت کی داد دیتے رہیں وہ اس داد و ستائش کی سطح پر جینا چاہتا ہے وہ مربی کی طرف رجوع کرتا ہے، مربی اس کے لئے جو علاج تجویز کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک سال کے لئے خطابت ترک کر دے بظاہر یہ ایسا علاج ہے جس میں دین کا سخت نقصان ہے۔ چنانچہ لوگ اسے ایسا کرنے سے منع کرتے ہیں لیکن وہ مربی کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے ایک سال کے لئے خطابت چھوڑ دیتا ہے۔ اس عرصے میں اس کی انا کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اب مربی اسے

اجازت دیتا ہے چنانچہ اب جب دوبارہ وہ خطابت شروع کرتا ہے تو اس کی بات میں غیر معمولی تاثیر پیدا ہوتی ہے۔اس کی تقریر دلوں کو متاثر کرتی ہے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔

اس سے ملتا جلتا ایک دوسرا واقعہ ہے۔ایک صاحب اپنی ذاتی اصلاح کے لئے ایک مربی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔مربی نے اس کے لئے تہجد، ذکر اذکار اور مطالعہ قرآن کی یومیہ ایک مقدار متعین کی۔کچھ دنوں کے بعد یہ ہوا کہ ان صاحب کے اندر اپنے زہد کا زعم پیدا ہونا شروع ہوا اور اس نے مربی کے ہاں آنے والے ہر فرد کی چھوٹی موٹی کمزوریوں پر روک ٹوک کا عمل شدت سے شروع کر دیا۔ مربی نے یہ صورت حال دیکھ کر اس کے ذکر اذکار اور تہجد وغیرہ کی یومیہ خوراک بند کی اور اسے مہمانوں کے برتن دھونے اور صفائی کے کام پر لگا دیا۔ایک ماہ کے دوران ہی اس کے اندر سے تکبر کی برائی دور ہوگئی اور تواضع کا جذبہ پیدا ہوا۔

اس قسم کا تیسرا واقعہ بھی ہے۔ایک صاحب جو ہندوستان کے بہت بڑے عالم تھے اور ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درس گاہ کے مہتمم تھے۔اس کے اندر اپنے علم وفضل کا بہت زیادہ زعم پیدا ہوا۔جس کا ہر وقت اظہار ہونے لگا۔وہ ایک ممتاز مربی کی طرف رجوع ہوئے اس نے اس کا یہ علاج بتایا کہ وہ دو ماہ تک مسجد میں آنے والے لوگوں کے جوتے درست کرے۔چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اس سے بڑائی اور بزرگی کا احساس ختم ہوگیا۔

ان واقعات سے اندازہ لگائیے کہ باطنی امراض کس نوعیت کے ہوتے ہیں۔دراصل معاشرہ کے جملہ امراض کے پس پردہ یہی عوامل اور نفسی خرابیاں کارفرما ہوتی ہیں۔جن چیزوں کو ہم علاقائی نیشنلزم یا سیاسی بے چینی قرار دیتے ہیں۔غور سے دیکھا جائے تو یہ مسائل بھی دراصل حب جاہ اور حب مال وغیرہ امراض کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔

حب جاہ اور نفسی خرابیوں کی اصلاح کے دو طریقے ہیں:

ایک مجاہدہ دوسرا صحبت، ان دونوں چیزوں سے مل کر صحیح معنی میں تزکیہ ہوتا ہے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اگر مجاہدہ ہو اور صحبت میسر نہ ہو تو بنیادی باطنی امراض کی اصلاح مشکل ہوتی ہے۔اسی طرح اگر صحبت حاصل ہو اور مجاہدہ نہ ہو تب بھی تزکیہ ادھورا رہ جاتا ہے۔مجاہدہ اس محنت کو کہا جاتا ہے جو نفس کو خرابیوں سے روکنے کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے۔جس اطاعت میں غفلت کا مظاہرہ ہو اس غفلت کا مقابلہ کر کے اطاعت کو بجا لایا جائے یا معصیت سے بچا جائے۔اس مقصد کے لئے کچھ مجاہدے کرائے

جاتے ہیں مثلاً تقلیل المنام، تقلیل الکلام، تقلیل الطعام اور تقلیل الاختلاط مع الانعام، جہاں تک تقلیل المنام کا تعلق ہے تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو مجاہدہ دیا ہے وہ قیام الیل ہے یعنی رات کا کچھ حصہ جاگ کر عبادت میں صرف کرنا ہے تقلیل الکلام کے لئے ذکر کا مجاہدہ ہے ظاہر ہے جب فرد ذکر میں مشغول ہوگا تو باتوں کے لئے وقت نہیں نکل سکتا۔ تقلیل الطعام کے لئے روزے متعین کئے گئے ہیں۔ تقلیل الاختلاط کے لئے اعتکاف ہے جب ان چار چیزوں کی مشق ہو جاتی ہے تو فرد کی داخلی زندگی میں بڑا انقلاب واقع ہوتا ہے اس کے بعد حب مال، حبِ جاہ اور جذبہ خودنمائی زیادہ پریشاں اور تنگ نہیں کرتی۔مزکی فرد کے لئے ان چار چیزوں میں سے کچھ چیزیں متعین کرتا ہے اور گناہوں سے بچنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ مزکی کی صحبت سے دوسری اہم چیز جو حاصل ہوتی ہے وہ فکر آخرت اور یاد آخرت ہے۔

صحبت کے سلسلہ میں اس دور کے ایک بہت بڑے مربی اور مزکی نے چند اہم باتیں کہیں تھیں۔ ملاحظہ ہو۔

میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ دین محض کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا، ضابطہ کا دین تو کتابوں سے حاصل ہوسکتا ہے مگر حقیقی دین کے حصول کے لئے جوتیاں درست کرنی پڑتی ہیں بلکہ جوتیاں کھانی پڑتی ہیں۔ دین کسی کی خوشامد نہیں کرتا، دین تو انہی طریقوں سے آتا ہے۔اب جس کا جی چاہے حاصل کرے،جس کا جی چاہے حاصل نہ کرے۔

صحبت سے جو بات حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام دل میں رچ بس جاتا ہے۔مذہب کی اصل روح یہی ہے کہ دل میں دین کی عظمت رچ بس جائے۔اگر دل میں دین کی عظمت نہیں ہے تو ظاہری ادائیگی فرائض سے وہ بات نہیں بنتی۔اس کی مثال طوطے کی سی ہے جسے صورتیں رٹا دی جائیں۔جو محض اس کی زبان پر ہو۔یہ بھی مشاہدہ میں آیا ہے کہ اگر کتابی علم کامل ہو اس کے ساتھ تزکیہ و تربیت نہ ہو تو کتابی علم سے چالاکی اور دھوکہ دہی کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔یہی صورت کتابی علم اور تربیت دونوں سے محرومی سے بھی پیدا ہوتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایسے مربی و مزکی بہت کم ہیں جن کو دیکھ کر خدا یاد آجائے اور جن کی صحبت سے قلبوں کا زنگ دور ہو۔لیکن پھر بھی ایسی شخصیتیں مفقود نہیں ہیں اگر نفسی بیماریوں کی اصلاح کے لئے اضطراب موجود ہو تو تلاش کے بعد مزکی و مربی مل جاتا ہے۔

درس حدیث

(رانا اعجاز احمد)

"حضرت ابو ہریرہ عبدالرحمٰن بن صخرؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے سنا، جس چیز سے میں تمہیں روکوں اس سے بچو اور جس چیز کا حکم دوں اسے مقدور بھر بجالاؤ، کیونکہ تم سے پہلے لوگوں کو ان کے سوالات کی کثرت اور انبیاء سے اختلاف ہی نے ہلاک کر دیا۔" (اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا)

انبیاء سے کثرت سوال کی ممانعت

حدیث میں تین اہم باتوں کی طرف مسلمانوں کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔

ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ جس چیز سے رسول اللہؐ مسلمانوں کو روک دیں اس سے بلا چون و چرا رک جانا چاہیے۔ اس معاملے میں کسی قسم کی حیل و حجت کی گنجائش نہیں :- قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے۔

"ما اتاکم الرسول فخذوہ مانھا کم عنه نانتھوا۔"

"رسول اللہ جو چیز تمہارے پاس لائیں اسے لے لو اور جس چیز سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔"

آخرت میں کامیابی کا راز صرف اسی بات میں پوشیدہ ہے کہ خدا کے رسول کی اطاعت کی جائے۔

ارشاد ربانی ہے:" من یطع الله ورسوله فقدفا زفوزاً عظیما"

"جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی وہ بہت بڑی کامیابی سے ہمکنار ہوا،،

اسی طرح رسولؐ کی حکم عدولی پر عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔

"ومن یشاقق الله ورسوله فان الله شدید العقاب"

"اور جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا تو اللہ بڑا سخت سزا دینے والا ہے۔"

دوسری بات اس حدیث میں یہ بیان کی گئی ہے کہ رسول اللہؐ جس بات کا حکم دیں اسے طاقت کے مطابق بجالاؤ۔ طاقت کے مطابق اس لئے کہ انسان اپنی طاقت سے بڑھ کر کسی عمل کا مکلف نہیں قرآن حکیم کہتا ہے۔

لایکلف اللہ نفساً الا وسعھا :"اللہ تعالیٰ کسی آدمی کو اس کی طاقت سے زیادہ پابند نہیں کرتا۔"

اور تیسری بات جو اس حدیث کے مضمون میں بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ نبی سے کسی مسئلے کے بارے میں بار بار نہ پوچھا جائے۔ غیر ضروری سوالات سے پرہیز کیا جائے، کیونکہ انبیاء سے بار بار سوال کرنے کی عادت یہودیوں کی تھی، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بار بار سوال کر کے انہیں تنگ کیا کرتے تھے اس پر انہیں اللہ تعالیٰ نے سزا دی اور ہلاک و برباد کیا۔ یہودیوں کے کہنے پر بعض منافقین بھی رسول خدا سے بے جا قسم کے سوالات کیا کرتے تھے اس لئے مسلمانوں کو اس روش پر چلنے سے منع کیا گیا۔ بعض دیہاتی عرب بھی آکر رسول اللہ کو بے تکے سوالات سے دکھ پہنچاتے، مثلاً ایک آدمی نے آپ سے پوچھا کہ بتایئے میرا والد کون ہے؟ اس قسم کے سوالات نبی کی شان اور آپ کے مزاج کے خلاف تھے اس لئے ان سے روکا گیا۔ کثرت سوال کی ایک خرابی تو یہ ہے کہ اس سے عمل کی قوت ختم ہو کر رہ جاتی ہے اور آدمی بحث کرنے کا عادی ہو جاتا ہے جو دین اسلام کی سادگی کے خلاف ہے اور دوسری خرابی اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن باتوں سے جان بوجھ کر اس لئے خاموشی اختیار کی ہے کہ لوگوں کے لئے کچھ اختیار باقی رہے سوال کرنے سے وہ وسعت جاتی رہتی ہے اور دین کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے اسی لئے نبی کریمؐ نے فرمایا:

"کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے قیل و قال اور کثرت سوال کو ناپسند کیا ہے" (مسلم)

ترمذی شریف میں ہے کہ جب حج کے فرض ہونے کا حکم اترا تو ایک آدمی نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ کیا حج ہر سال فرض ہے؟ آپ نے فرمایا اگر میں ہاں کہہ دیتا تو واجب ہو جاتا آپ کا ارشاد ہے: سب سے بڑا مجرم وہ ہے جس نے کسی حلال چیز کے بارے میں پوچھا اور اس کے سوال کی وجہ سے وہ چیز حرام کر دی گئی۔

واختلافھم علی انبیاھم کا معنی بھی یہی کہ لوگ سوال کرنے کے لئے بار بار نبیوں کے پاس نہ آئیں۔

☆☆☆☆☆☆

فرعون کی لاش

(محمد صدیق ڈار توحیدی)

قرآن کریم میں انبیاء کرام میں سے سب سے زیادہ ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آیا ہے۔ جب اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے ظلم وستم سے نجات دلانے کے لئے اپنی قوم کو لے کر راتوں رات مصر سے نکل پڑے تو خبر ہو جانے پر فرعون بھی اپنا لاؤ لشکر لے کر ان کے تعاقب میں چل پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت قاہرہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو بحیرات مرہ جو اس زمانے میں بحیرہ احمر سے ملی ہوئی تھیں سے پار گذار کر فرعون اور اس کے لشکر کو ڈبو دیا۔ اس وقت ربوبیت کا دعویٰ کرنے والے فرعون کے دماغ سے اپنی بادشاہت اور آمریت کا بھوت کافور ہو گیا، اور عقل ٹھکانے آ گئی۔ وہ بھی پکار اٹھا کہ میں بنی اسرائیل کے خدائے لاشریک پر ایمان لاتا ہوں اور مسلمان ہوتا ہوں۔ قرآن کریم میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ فرمایا:

فالیوم ننجیك ببدنك لتكون لمن خلفك آیة (یونس۔ 91)

''آج ہم تیرے بدن کو بچالیں گے تاکہ تو پچھلوں کے لئے عبرت کا نشان ہو''

جس وقت قرآن کا نزول ہوا اس وقت فرعون کی لاش کا کوئی اتا پتا معلوم نہ تھا اس لئے اس آیت کو متشابہات میں شمار کیا جاتا تھا۔ مفسرین یہی فرماتے تھے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرعون کا بدن آنے والے انسانوں کی عبرت کے لئے باقی رہے گا لیکن اس آیت کی حقیقت سے اللہ ہی آگاہ ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی جس بادشاہ نے مخالفت کی تھی فرعون اس کا نام نہیں تھا بلکہ یہ تو مصر کے بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا۔ مصر پر فراعین کے تیس خاندانوں نے تقریباً ساڑھے تین ہزار برس حکومت کی اور فرعونوں کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔

مختلف فراعین نے اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر جو مقبرے تعمیر کروائے وہ اہرام کی صورت میں اب بھی موجود ہیں۔ تحقیق وتفتیش کرنے والوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں مختلف جگہوں پر کھدائیاں کر کے اور کئی اہراموں کو کھول کر فرعونوں کی حنوط شدہ لاشیں دریافت کر لیں۔

لیکن موسیٰ علیہ السلام کے دور والے فرعون کی لاش نہ ملی۔ آخر کار تلاش بسیار کے بعد 1907ء میں ایک انگریز مفتش سر گرافٹن سمتھ کی کوششوں سے ایک فرعون کی لاش برآمد ہوئی اور تحقیق کے بعد یہ

تصدیق ہوگئی کہ یہی فرعون موسیٰ ہے اور اس کی موت پانی میں ڈوبنے ہی سے واقع ہوئی تھی۔ یہ فرعون رعمسس خاندان کا تیسرا بادشاہ ہونے کی بنا پر رعمسس سوئم کہلواتا تھا اور اسکا نام منفطہ (Muneptah) تھا۔ اس طرح فرعون کی موت کے تقریباً ساڑھے تین ہزار برس بعد اسی لاش منظر عام پر آ گئی اور اللہ کی آخری الہامی کتاب قرآن کریم کی صداقت روز روشن کی طرح واضح ہوگئی۔ یہ لاش آج بھی مصر کے عجائب گھر میں انسانوں کے لئے عبرت کا سامان فراہم کرنے کے لئے موجود ہے۔ چند برس قبل اس لاش کو پھپھوندی لگنے لگی تو یہ خبر دنیا بھر کے اخباروں میں چھپی۔ جب لاش کو ریڈیائی شعاعوں کے علاج کے لئے ایک خصوصی ہوائی جہاز کے ذریعے فرانس لے جایا گیا تو وہاں سے مکمل شاہی پروٹوکول دیا گیا اور ہوائی اڈہ پر اسے ایک سربراہ مملکت کے شایان شان گارڈ آف آنرز نے سلامی پیش کی مجوزہ علاج کے بعد فرعون کی لاش مصر واپس بھیج دی گئی۔

نباتات میں سبز مادے کی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے زمین پر وافر مقدار میں پانی نازل فرمایا جس کے باعث روئیدگی ہوئی اور انواع واقسام کی جڑی بوٹیاں، پودے اور درخت پیدا ہوئے۔ پانی نباتات کی جڑوں، ٹہنیوں، اور پتوں کی رگ رگ میں موجود ہوتا ہے۔ سورج کی روشنی اور پانی کے ردعمل سے نباتات میں نہایت ہی اہم ایک سبز رنگ کا مادہ پیدا ہوتا ہے جسے " کلوروفل " کہتے ہیں۔ اسی کے ذریعے نباتات میں دانے اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ آج سے چودہ سو برس قبل اس سبز مادے کی تخلیق، غرض وغایت اور اہمیت کے بارے میں کسی انسان کو کوئی علم نہ تھا۔ لیکن اللہ علیم وخبیر جو ہر شے کا خالق اور ہر چیز کی حقیقت سے آگاہ ہے اس نے اپنی آخری کتاب میں اس سبز مادے کی حقیقت کو بڑی وضاحت سے بیان فرمادیا۔ چنانچہ سورۃ الانعام کی آیت 99 میں ارشاد فرمایا:

وھو الذی انزل من السماء ماء فاخرجنابه نبات کل شیء فاخرجنا منه خضراً نخرج منه حبا متراکبا۔

ترجمہ:۔ ''اللہ وہی تو ہے جو آسمان سے مینہ برساتا ہے پھر ہم ہی اس سے ہر طرح کی روئیدگی اگاتے ہیں پھر ہم ہی اس میں سے ایک سبز مادہ (کلوروفل) نکالتے ہیں جس سے ہم ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے دانے نکالتے ہیں۔''

انسانی جلد اور حرارت کا احساس

حواس خمسہ میں سے دیکھنے، سننے، سونگھنے، اور چکھنے کا عمل بالترتیب آنکھ، کان، ناک اور زبان کے توسط سے واقع ہوتا ہے۔ جسم کا دوسرا کوئی حصہ ان کی جگہ کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ ان حواس کے برعکس لمس یعنی چھونے کی حس جس کے ذریعے چیزوں کی نرمی، سختی اور ان کی گرمی، سردی کا احساس ہوتا ہے سارے جسم میں پھیلی ہوئی ہے۔ بالوں اور ناخنوں کے سوا جسم کے کسی بھی حصے کے ساتھ کوئی چیز مس کر جائے تو اس کی سطح کی کیفیت اور درجہ حرارت کا احساس انسان کو ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حرارت کا احساس کرنے والا نہایت ہی حساس اور نازک نظام انسان کی جلد کے نیچے چھپا رکھا ہے۔ چند برس پہلے سعودی عرب میں ماہرین جلد کی ایک بین الاقوامی کانفرنس ہوئی تو حرارت کو محسوس کرنے والے نظام کے بارے میں ایک مسلمان ڈاکٹر نے ایک قرآنی آیت پیش کی تو چین کا ایک ماہر جلد اتنا متاثر ہوا کہ قرآن کی صداقت کو تسلیم کرتے ہوئے فوراً مسلمان ہو گیا۔ وہ آیت کریمہ یہ ہے:-

ان الذین کفروا بایٰتنا سوف نصلیھم نارا کلما نضجت جلو دھم بدلنٰھم جلوداً غیر ھا لیذوق العذاب ان اللہ کان عزیزاً حکیماہ (انساء۔56)

"جن لوگوں نے ہماری نشانیوں سے انکار کیا۔ ہم عنقریب انہیں آگ میں ڈالیں گے۔ جب ان کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم ان کو دوسری کھالوں سے بدل ڈالیں گے تاکہ وہ مسلسل عذاب کو محسوس کرتے رہیں۔ بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔" (انساء۔56)

اس چینی ڈاکٹر نے یہ اعتراف کیا کہ یہ بات تو ہمیں حال ہی میں معلوم ہوئی ہے کہ حرارت کو محسوس کرنے والے نازک نازک سے سیل (Sensors) جلد کے عین نیچے ہوتے ہیں۔ اگر یہ آگ سے جل کر بیکار ہو جائیں تو اس کے بعد حرارت کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جہنم میں جانے والوں کو مسلسل تکلیف میں رکھنے کے لئے اللہ عزیز و حکیم جلی ہوئی جلدوں کو نئی جلدوں سے تبدیل کرتے رہیں گے۔ 1400 برس پرانی کتاب میں اس حقیقت کا درج ہونا نہایت واضح ثبوت ہے کہ یہ کتاب اللہ کی نازل کی ہوئی ہے اور اس کا علم ازلی اور قدیم ہے۔

سات آسمان

قرآن کریم میں سماء جس کا ترجمہ آسمان کیا جاتا ہے بلندی، فضا اور خلاء کے معنوں میں بھی

استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ بارش کے بارے میں ایک آیت میں فرمایا گیا ہے:

وھو الذی انزل من السماء ماءً (الانعام۔99)

''اللہ وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا۔''

اس جگہ سماء سے مراد کرہ ارض کے اردگرد پھیلی ہوئی فضاء ہی مراد لی جاسکتی ہے کیونکہ یہ بات عملی طور پر انسان کے مشاہدے میں آچکی ہے کہ بارش کا پانی بادلوں سے نکلتا ہے جو فضا میں صرف چند ہزار فٹ کی بلندی پر معلق ہوتے ہیں۔ پہاڑی مقامات پر جہاں بادل بہت کم بلندی پر اڑتے پھرتے ہیں وہاں بادل کے آوارہ ٹکڑے گھروں کے اندر گھس کر بھی برس پڑتے ہیں۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ نے یہی ارشاد فرمایا کہ ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں۔ قرآن کریم میں کئی مقامات پر سات آسمانوں کی تخلیق کا ذکر ہے اور کئی جگہوں پر صرف سماوات یعنی آسمانوں کا نام آیا ہے۔ مندرجہ بالا معنوں کے لحاظ سے غور طلب بات یہ ہے کہ سات آسمانوں سے مراد فضا یا خلا کے کونسے طبقات مراد ہیں۔ کائنات کی وسعت کے بارے میں انسان اب تک جو کچھ جان چکا ہے گذشتہ صفحات میں اسکی مختصر سی جھلک آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ہماری زمین جس نظام شمسی کا حصہ ہے وہ ہماری کہکشاں کے ایک سرے پر واقع ہے۔ خود ہماری اس کہکشاں کے اندر ہمارے سورج سے کئی کئی گنا بڑے سینکڑوں سورج اور نظامہائے شمسی موجود ہیں۔ گویا ہماری اپنی کہکشاں ے اندر بھی ہمارے سورج اور نظام شمسی کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے۔ جب کہ پوری کائنات کے بارے میں ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ اس میں کل کہکشاؤں کی تعداد تقریباً ایک ارب ہے جو بڑی تیز رفتاری سے ایک دوسری سے دور ہٹتی چلی جارہی ہیں۔ اس پس منظر میں سات آسمانوں کی حدود کیونکر متعین کی جائیں۔ موجودہ دور کے ہیئت دان جو خلا کی وسعتوں کے حیرت کدہ میں گم ہیں ان کی نظر میں بھی سات ایک کمتر اہمیت کا حامل اور محدود سا ہندسہ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں دیئے گئے سات آسمانوں سے مراد اس پھیلی ہوئی کائنات کی کہکشاؤں کے کوئی سات طبقات مراد ہیں یا انسانوں کے محدود علم کے مطابق صرف کرہ زمین کے حوالے سے اس کے اوپر سات آسمانی طبقات کا تذکرہ کیا گیا ہے تا کہ انسان پہلے اپنے نظام شمسی میں واقع زمین کے پڑوسی سیاروں کے بارے میں جان کر اپنے خلائی علم اور سفر کی ابتدا کرسکے۔ قرآن کریم میں زمین اور سات آسمانوں کی تخلیق کے بارے میں آیا ہے:-

ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً ہم استویٰ الی

السماء فسوهن سبع سموت ط وهو بكل شيء عليمo

" وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لئے پیدا کیں۔ پھر آسمان یا بلندی کی طرف متوجہ ہوا تو اسکے ٹھیک سات آسمان یا طبق بنا دیئے۔ اور وہ ہر چیز سے خبر دار ہے۔"

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے زمین پر بنی نوع انسان کی حیات کے بقا کے لئے ہر چیز پیدا فرمائی اس کے بعد اس کے ساتھ پیوستہ فضا کی بلندی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے سات آسمان، منطقے یا طبقے بنا دیئے۔ یعنی پہلے سب کچھ آپس میں جڑا ہوا تھا پھر انہیں دور دور مناسب فاصلوں پر جدا جدا کر کے سات سماوات بنا دیئے۔ کیا ان سے ہم زمین کے اوپر گردش کرنے والے سات دوسرے سیاروں کے مدار مراد لے سکتے ہیں۔ جو ایک نظام شمسی کا حصہ ہیں۔ قرآن حکیم کی سورۃ المومنون کی آیت 17 میں صاف صاف فرمایا گیا ہے:-

ولقد خلقنا فوقكم سبع طرائق وما كنا عن الخلق غفلينo

"اور ہم نے تمہارے اوپر سات راستے یا مدار پیدا کئے اور ہم خلقت سے غافل نہیں ہیں"

اسی طرح سورۃ النباء کی آیت 12 میں ارشاد فرمایا:-

وبنينا فوقكم سبعاً شداداًo

"اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط نظام بنائے ہیں"

فطرت کو سمجھنے کے لئے سائنس نظریات گھڑتی اور پھر خود ہی انہیں غلط ثابت کر کے انکی جگہ زیادہ قابل قبول خیالات آگے بڑھاتی چلی جاتی ہے۔ اب تک یہی بیان کیا جاتا رہا ہے کہ سورج کے گرد گردش کرنے والے تمام سیارے کسی وقت سورج سے الگ ہوئے تھے۔ اسی طرح چاند جو کہ زمین کے گرد چکر کاٹ رہا ہے وہ کسی وقت کسی وجہ سے زمین سے ٹوٹ کر الگ ہوا تھا۔

اب حال ہی میں چاند سے لائی جانے والی مٹی کے تجزیہ کے نتیجے میں سائنسدان گذشتہ نظریے سے دستبردار ہو کر یہ کہہ رہے ہیں کہ چاند کبھی بھی زمین کا حصہ نہیں رہا ہے بلکہ اس کی عمر تو زمین سے زیادہ ثابت ہو گئی ہے۔ اسی طرح اس امر کا قوی امکان ہے کہ مزید تحقیق سائنسدانوں کو قرآنی آیات کا ہمنوا ہونے پر مجبور کر دے اور وہ اپنے نظام شمسی کے دوسرے سیاروں کی نسبت کرہ ارض کی اہمیت کو تسلیم کر لیں اور یہ سات آسمان صرف ہمارے اپنے نظام شمسی کا ہی حصہ قرار پائیں۔ قرآن کریم کی ایک اور آیت تخلیق کی ترتیب پر مزید روشنی ڈالتی ہے اور اس دائمی معجزہ سے انکار کرنے والوں کو چیلنج کر رہی ہے:

اولم یر الذین کفروا ان السمٰوٰت والارض کانتا رتقاً ففتقنٰھما ط

(الانبیاء۔30)

''کیا انکار کرنے والوں نے دیکھ نہیں لیا کہ سماوات اور ارض باہم ملے ہوئے تھے پس ہم نے انکو جدا کر دیا۔''

اس آیت مبارکہ میں ایک دقیق نکتہ یہ بھی ہے کہ ملاپ والی صورت حال میں زمین اور آسمانوں کے لئے ھما کا لفظ آیا ہے جو عربی میں دو چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی پہلی چیز زمین تھی اور دوسرا وہ مواد جس سے آسمان بنائے گئے۔ اس سے بھی زمین کی خصوصی اہمیت کا اظہار ہو رہا ہے جو سات آسمانوں کے مقابل ہے۔ ان آیات کے علاوہ اگر فرقان حمید کی مندرجہ ذیل آیت پر تدبر و تفکر کیا جائے تو اس خیال میں مزید وزن پیدا ہو جاتا ہے کہ سبعہ سماوات سے مراد صرف ہمارے نظام شمسی کے سات طبقات ہیں نہ کہ پوری کائنات۔

الم تر و کیف خلق الله سبع سمٰوٰت طبقاً وجعل القمر فیھن نوراً وجعل الشمس سراجاًo (نوح۔)

" کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ کس طرح اللہ نے سات سماوات اوپر نیچے بنائے اور ان میں چاند کو اجالا بنایا اور سورج کو چراغ بنایا۔"

یہاں یہ وضاحت فرما دی گئی کہ یہ سات آسمان ایک دوسرے کے اوپر طبقات کی صورت میں واقع ہیں۔ ان میں اجالا کرنے کے لئے چاند بنایا ہے اور سورج کو جلتے ہوئی چراغ کی مانند اپنا ایندھن جلا کر روشنی اور حرارت مہیا کرنے کا کام سپرد کر رکھا ہے۔ موجودہ خلائی تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہمارا سورج پوری کائنات کو روشنی نہیں دے رہا بلکہ یہ تو کروڑوں کہکشاؤں میں سے ایک کہکشاں کے کونے میں ایک معمولی سا روشنی اور حرارت کا ذریعہ ہے جو صرف اپنے گرد گھومنے والے چند سیاروں کے لئے کفیل ہے۔ ان سب کی محوری اور مداری رفتار ایک دوسرے سے مختلف ہے اور اسی وجہ سے انکے دن رات اور سال کی مدتیں زمین سے مختلف ہیں۔ بہر کیف اس آیت سے یہ حقیقت قرین قیاس دکھائی دیتی ہے کہ سورج کو جن سات آسمانوں کے لئے روشنی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے ان سے مراد وہ سات سیاروں کے مدار یا طبقات ہیں جو زمین کے اوپر واقع ہیں۔ واللہ اعلم

آسمانوں کے فاصلے

جس نظام میں ہماری زمین واقع ہے اس کا مرکز سورج ہے جس کے گرد کچھ سیارے ایک دوسرے سے ہٹ کر اپنے اپنے دائرے یا مدار میں تیرتے ہوئے چل رہے ہیں۔ سورج سے قریب ترین سیارہ عطارد ہے، اس کے بعد زہرہ، پھر تیسرے نمبر پر ہماری زمین ہے۔ زمین سے مزید اوپر جن سیاروں کے مدار ہیں ان کی تعداد کا تعین ماضی قریب تک نہ ہو سکا ہے۔ پچھلے صفحات میں ہم تحریر کر آئے ہیں کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ تمہارے اوپر ہم نے سات راستے بنائے ہیں۔ ایک دوسری آیت میں سات مضبوط نظاموں یا چنائیوں کا ذکر آیا ہے۔ حالانکہ خلائی ماہرین زمین کے اوپر صرف پانچ سیاروں کے وجود کو تسلیم کرتے تھے۔ 1930ء میں ہمارے نظام شمسی کا سب سے چھوٹا اور بعید ترین سیارہ پلوٹو دریافت ہوا جس کا قطر اڑھائی ہزار کلومیٹر سے بھی کم ہے۔ پلوٹو کی دریافت سے ان سیاروں کی تعداد چھ ہوگئی۔ قرآنی حقائق کے مطابق زمین کے اوپر سات سیارے ہونے چاہئیں۔ اب ذرا معجزے کا اظہار ملاحظہ فرمایئے۔ کہ اس ساتویں سیارے کی موجودگی کا علم ایک حسابی فارمولے کے ذریعے سے ہوا جو قادر مطلق نے ان سیاروں کے درمیانی فاصلوں کی نسبت میں چھپا رکھا تھا۔ ایک ہیئت دان یہ حقیقت دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ ہمارے نظام شمسی کے سیاروں کا سورج سے فاصلہ بے ترتیب نہیں بلکہ ایک خاص حسابی نسبت سے ہے۔ اس نے ستاروں کے مقامات کو نومنزلوں سے تعبیر کرتے ہوئے یہ فارمولا بنایا کہ یہ نومنزلیں تین کے قدر سے شروع ہو کر دگنی ہوتی چلی جاتی ہیں یعنی 0'3'6'12'24 علیٰ ھذٰا قیاس۔ اب ہر ایک میں مزید چار کا عدد جمع کیا جائے۔ اب ان کی صورت یہ بن گئی 28,16,10,7,4..... الخ۔ ان حاصل جمع اعداد کو نو ملین سے ضرب دی جائے تو ہر سیارے کا سورج سے تقریبی فاصلہ میلوں میں آجائے گا۔ سبحان اللہ ان بظاہر بے ترتیب فاصلوں کے اندر بھی نظم و ترتیب موجود ہے۔ اسطرح سورج سے عطارد کا فاصلہ تقریباً 36 ملین میل، زہرہ کا 63 ملین میل اور زمین کا 90 ملین میل بنا جو کہ درست ہے۔ اس فارمولے میں بس ایک نقص نظر آیا۔ وہ یہ کہ اس حساب سے مریخ اور مشتری کے درمیان والی منزل پر بھی ایک سیارہ ہونا چاہئے تھا جو کہ اس وقت انسانی علم میں نہ تھا۔ جب بڑی اور طاقتور دوربینوں سے جائزہ لیا گیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس جگہ کسی وقت ایک سیارہ گردش کرتا تھا جو کسی نامعلوم وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگیا۔ اب اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اسی مدار میں گھوم رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ایک سیارہ کی بجائے سیارات جفرہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس طرح سائنس گھسٹتی لڑھکتی اس قرآنی حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے اوپر سات راستے یا آسمان بنا رکھے ہیں۔

کیا جہیز دینا سنت ہے

(مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری)

عورتوں کے اسلامی حقوق

اسلام نے عورتوں کو جتنے حقوق دیئے ہیں ان سے زیادہ حقوق آج تک کسی مذہب، کسی قوم اور کسی مملکت نے اس ترقی یافتہ دور میں بھی نہیں دیئے ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ عملی زندگی میں مسلمان قوم نے ان حقوق کا بڑا حصہ سلب کرلیا ہے اور دوسری طرف جن قوموں کے مذاہب نے عورتوں کو برائے نام حقوق دیئے تھے ان قوموں نے عورتوں کو عملاً بہت کچھ حقوق دے دیئے ہیں یا دے رہے ہیں۔ تارک مذہب تو مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ لیکن اسی ترک مذہب سے مسلمان نیچے آ گرے اور غیر مسلم آسمان عروج پر پہنچ گئے۔

ایک لگن کے دو ہیں اثر اور دونوں حسب مراتب ہیں
لو جو لگائے شمع کھڑی ہے، رقص میں ہے پروانہ بھی

ترک مذہب کے یہ دونوں اثرات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ادھر ترک اسلام کے نتیجے میں رسوم کفر کی پیروی ہو رہی ہے اور ادھر ترک کفر کے ساتھ ساتھ اسلامی اصول کو اپنایا جا رہا ہے۔

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

جہیز اور مسلمان

اس کی مثال میں ہندو دھرم اور اسلامی دین کی صرف ایک بات کو پیش کرنا کافی ہے۔ ہندو دھرم میں دختر کے لئے وراثت میں کوئی حصہ نہیں اس لئے وہ اس کی تلافی یوں کرتے رہے کہ جب بیٹی کی شادی کرتے تو جتنا کچھ اسے دے سکتے جہیز کے نام سے دے دیتے۔ مسلمان بھی یہی کچھ ان کی دیکھا دیکھی کرنے لگے۔ بہت سے خاندانوں میں بیٹی کو ترکہ نہیں ملتا۔ سارے مسلمان ایسا نہیں کرتے لیکن دوسرے حصے پر سب عمل کرتے ہیں یعنی بیاہتے ہوئے اسے جہیز دینا اتنا ضروری سمجھتے ہیں کہ گویا اس کے بغیر شادی ہی مکمل نہیں ہوتی۔

تبدیل رسم

یہ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہندو اپنے دھرمی اصولوں کو ترک کر رہے ہیں اور اس ترک کے خلا کو

اسلامی اصولوں سے پرکر رہے ہیں۔ یعنی اب دختر کو ترکہ دلوار ہے ہیں اور جہیز کے لئے قانوناً ایک حد مقرر کر دی گئی ہے اور اس کے بالمقابل مسلمانوں نے یہ کیا کہ ہندو اصول پر جمے ہوئے ہیں۔ جہاں قانون مجبور کر دے وہاں ترکہ تو دے دیتے ہیں لیکن جہیز کو ایسی لازمی شرط ازدواج قرار دے رکھا ہے کہ اس کی فکر میں مرتے رہتے ہیں اور اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اہل جاہلیت کی طرح بیٹی کی ولادت کو اپنے لئے ایک بڑی مصیبت تصور کرتے ہیں۔

رسم جہیز کس طرح آ گئی

یہاں تک تو خیر کچھ غنیمت تھا اس لئے کہ مسلمانوں کو جب بھی یہ احساس ہوگا کہ جہیز محض ہندوؤں کی ایک رسم ہے تو وہ اسے ترک کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے لیکن غضب تو یہ ہوا کہ انہوں نے اسے سنت رسول بھی قرار دے دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سنت کے بغیر دین مکمل نہ ہو تو ازدواج بھی بغیر سنت جہیز کے مکمل نہیں ہوسکتا۔ پھر سب سے زیادہ دلچسپ استدلال جہیز کے سنت ہونے پر یہ ہے کہ حضور اکرمؐ نے سیدہ فاطمہ زہرہؓ کو جہیز دیا تھا۔ جس میں بان کی چارپائی، چکی، مٹی کے گھڑے، فیل دنداں کے کنگن، چاندی کا ہار، مشکیزے اور اذخر سے بھری ہوئی تو شک تھی۔ گویا مقدمات کی ترتیب یوں ہوئی کہ......... حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ کو فلاں فلاں چیزیں جہیز میں دیں۔ لہٰذا جہیز دینا سنت ٹھہرا۔ اور سنت کے بغیر دین مکمل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا جہیز کے بغیر ازدواج مکمل نہیں ہوگا۔ آپ نے ملاحظہ فرمالیا؟ کہ ایک غیر اسلامی اور خالص ہندوانہ رسم کس طرح رواج پا گئی۔

مہر کی بجائے جہیز

اب ہمارے معروضات کو بھی بغور سن لیجئے۔ آپ کے سامنے خدا کی کتاب رکھی ہے، احادیث کے دفتر موجود ہیں، ہر مشرب کی کتب فقہ رکھی ہوئی ہیں۔ آپ کو ہر ایک جگہ زر مہر کی تصریح ملے گی۔ قرآن نے اسے فریضہ، صدقات اور اجر کہا ہے۔ احادیث میں اسے، صداق اور مہر بھی کہا گیا ہے۔ فقہ میں اس کے مستقل ابواب موجود ہیں اور ہر جگہ اسے ایک واجب الادا فرض بتایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ مسند احمد کی روایت ہے کہ:

"من تذوج امراة بصداق و نویٰ ان لا یودیه فهوذان"

"جو شخص ایک عورت سے کسی مہر پر نکاح کرے اور نیت یہ ہو کہ اسے ادا نہیں کرے گا تو اس کا

شمار زانیوں میں ہے۔''

اور قرآن میں تو بار بار اس کی تاکید آئی ہے کہ عورتوں کو ان کا مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرو۔ سب کا ذکر یہاں مقصود نہیں۔ عرض یہ کرنا ہے کہ مہر کے سارے احکام قرآن میں، حدیثوں میں، اور فقہ میں وضاحت کے ساتھ موجود ہیں لیکن جو چیز آپ کو کہیں بھی نہیں ملے گی وہ ہے جہیز کا ذکر۔ قرآن اس کے ذکر سے قطعاً خالی ہے۔ احادیث میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ حتیٰ کہ فقہ میں کہیں کوئی باب الجہیز موجود نہیں۔ اب خود ہی اس سوال کو حل کیجئے کہ یہ جہیز سنت کیسے بن گیا؟

پھر اس پر بھی غور فرمایئے کہ حضورؐ کی اور بھی تین صاحب زادیاں تھیں زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ۔ لیکن کیا آپ نے کبھی یہ بھی سنا کہ حضورؐ نے زینبؓ کو یہ یہ چیزیں جہیز میں دیں۔ یا رقیہؓ و ام کلثومؓ کو جہیز دیا جس میں فلاں فلاں چیزیں تھیں۔ اسے بھی جانے دیجئے حضورؐ کے شرف زوجیت میں کتنی امہات مومنینؓ آئیں لیکن آپ نے کہیں یہ بھی پڑھا ہے کہ عائشہؓ کے جہیز میں یہ چیزیں تھیں؟ یا حفصہؓ، سودہؓ یا دوسری ازواج النبیؐ فلاں فلاں چیزیں اپنے ساتھ جہیز میں لائی تھیں؟ چلئے جانے دیجئے۔ دوسرے بے شمار صحابہؓ نے بھی شادیاں فرمائیں لیکن کتنوں کے متعلق آپ نے کبھی یہ ذکر پڑھا ہے کہ ان کی ازواج "سنت رسولؐ" کے مطابق اپنے ساتھ جہیز لائی تھیں؟ پھر ذرا عقل پر زور دے کر سوچیے کہ آخر یہ سنت رسول کی کونسی قسم ہے جو ازدواج فاطمہؓ کے سوا کہیں بھی نظر نہیں آتی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ حقیقت کچھ اور ہو اور ہم نے فرض کر لیا ہو کچھ اور؟ ہاں یقیناً یہی بات ہے آیئے ذرا غور کریں۔

حقیقت حال

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حضورؐ نے وہ چیزیں (جن کا اوپر ذکر ہوا) جناب فاطمہؓ کو دیں لیکن کیا یہ وہی چیز تھی جسے ہم عرف عام میں "جہیز" کہتے ہیں؟ یقیناً نہیں۔ جہیز کی اصطلاح سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ پھر یہ کیا تھا؟ اسی مسئلے پر اس وقت غور کرنا ہے۔ ذرا توجہ سے کام لے کر حقیقت حال پر غور فرمایئے۔

حضورؐ جناب فاطمہؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے کفیل و سرپرست تھے اس لئے دونوں کے ازدواج کا اہتمام بھی حضورؐ ہی کو کرنا تھا۔ جناب علیؓ کا کوئی الگ گھر نہ تھا۔ حضورؐ کو ایک الگ گھر بسانا تھا اس لئے اس کا انتظام بھی حضورؐ ہی فرما رہے تھے۔ گھر داری کے انتظام کے لئے جو کچھ

مختصر سا اہتمام حضورؐ نے مناسب سمجھا کر دیا۔ سونے کو چارپائی اور اذخر (گھاس) بھری توشک اور تکیہ، مشکیزے، گھڑے، چکی۔ رہا چاندی کا ہار تو وہ یوں بھی حضرت فاطمہؓ ہی کا تھا جو آپ کو سیدہ خدیجہؓ کے ترکے میں ملا تھا۔ یہ سارا انتظام حضورؐ کو اس لئے کرنا پڑا کہ آپ کو ایک الگ گھر بسانا تھا۔ اگر حضرت علیؓ کا پہلے سے کوئی الگ گھر ہوتا تو حضورؐ اتنا کچھ بھی نہ کرتے۔

حضرت ابوالعاصؓ کا گھر پہلے سے موجود تھا اس لئے سیدہ زینبؓ کو بیاہنے کے لئے حضورؐ نے ایسا کوئی انتظام نہ کیا۔ سیدنا عثمانؓ کا الگ گھر بھی پہلے سے موجود تھا اس لئے سیدہ رقیہؓ اور سیدہ ام کلثومؓ کو بیاہنے میں حضورؐ کو ایسے کسی اہتمام کی ضرورت نہ پڑی۔ اسی طرح حضورؐ کی زوجیت میں جو امہات مومنینؓ آئیں ان کے والدین کو بھی ایسے کسی انتظام کی حاجت نہ تھی۔ لیکن سیدنا علیؓ کی حیثیت ان سے مختلف تھی۔ اب تک وہ حضورؐ کے ساتھ ہی رہتے تھے اور جب ازدواج فاطمہؓ ہوا تو سارا اہتمام ازسرنو کرنا پڑا۔ سیدنا علیؓ کے پاس کوئی الگ گھر نہ تھا۔ ایک انصاری حارثہ بن نعمانؓ نے اپنا ایک گھر حضورؐ کی خدمت میں اسی مقصد کے لئے بخوشی پیش کر دیا جس میں یہ پاکیزہ نیا جوڑا منتقل ہو گیا۔ اور گھرداری کے فقیرانہ اسباب وہاں بھیج دیئے گئے۔ یہ جہیز نہ تھا، صرف ایک نیا انتظام خانہ داری تھا۔ اگر جہیز ہوتا تو حضورؐ اپنی ہر بیٹی کو اسی طرح جہیز دیتے اور ہر ام المومنینؓ بھی اپنے ساتھ حضورؐ کے ہاں جہیز لاتیں۔

یہ ہے اصل حقیقت جسے "جہیز" کا نام دے دیا گیا ہے اور اسے سنت رسولؐ سمجھ لیا گیا ہے۔

ایک اور بات

اس کے جہیز نہ ہونے کی ایک اور دلیل بھی سن لیجئے۔ جناب خدیجہؓ کے متروکات کے سوا دوسری چیزیں حضورؐ نے کہاں سے مہیا فرمائی تھیں؟ یہ بھی یاد رکھنے کے قابل چیز ہے۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے حق مہر پہلے ہی لے لیا تھا۔ یہ ایک حطمیہ زرہ تھی جو حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سوا سو روپیہ کی رقم (تقریباً پانچ سو درہم) میں فروخت کی تھی۔ یہی مہر کی رقم حضرت علیؓ حضورؐ کی خدمت میں لے کر آئے اور اسی رقم سے حضورؐ نے گھرداری کا سارا سامان اور کچھ خوشبو وغیرہ منگوائی تھی۔ ذرا سوچئے کیا جہیز کی یہی صورت ہوتی ہے؟ اگر لوگ فی الواقع جہیز کو سنت سمجھتے ہیں تو انہیں چاہئے کہ اسے زرِ مہر ہی سے مہیا بھی کریں۔

غلط فہمی کی ابتداء

اب آئیے ذرا اس پر غور کریں کہ جہیز کی یہ غلط فہمی کیسے پیدا ہوئی؟ بات یوں چلی کہ بیہقی وغیرہ کی روایت میں ہے کہ:

جهز رسول الله صلى الله عليه وسلم فاطمة فی خمیل...... الخ

"حضور ﷺ نے حضرت فاطمہ ؓ کے لئے اونی چادر اور فلاں فلاں چیزیں مہیا فرمائیں"

یہاں جھز کے معنی کسی دور میں "جہیز دینا" کر لئے گئے اور یہ غلطی چل پڑی۔ رفتہ رفتہ اس پر اس غلط فہمی کے دبیز پردے پڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ آخر کار لوگوں نے جہیز کو سنت رسول ﷺ بنا چھوڑا۔

جھز تجہیزاً کے معنی ہیں سامان تیار کرنا، مہیا کرنا، خواہ وہ کسی مسافر کے لئے ہو یا کسی دلہن کے لئے یا کسی میت کے لئے۔ سورۃ یوسف میں ہے:

فلما جهذهم بجهاذهم.....

"جب یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کا سامان تیار کر دیا۔"

یہاں کون یہ ترجمہ کر سکتا ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو جہیز دیا؟

ہم جب "میت کی تجہیز" کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے "جہیز" کون مراد لیتا ہے؟

احادیث میں بہت جگہ یہ لفظ آیا ہے۔ اور کہیں بھی "جہیز" کے معنی نہیں۔

من جهز غازیاً.....(بخاری)۔**من جهز جیش العسرة.......** (بخاری)۔**کنت اجهز للشام......**(ابن ماجہ)۔ **انی لاجهز جیشی ....** (بخاری)۔**کنا فی من جهز عائشة.......**(مسند احمد)۔**فجهزت نصف الجیش ......** (ترمذی) وغیرہ۔

یہی شکل دلہن کی ہوتی ہے۔ کوئی والدین اپنی بیٹی کو شادی کے بعد گھر سے اس طرح رخصت نہیں کرتے کہ اس کے کپڑے بھی اتر والیں۔ پدری اور مادری محبت کچھ نہ کچھ ساتھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور یہ سلسلہ صرف رخصتی کے وقت تک ہی محدود نہیں رہتا۔ والدین ساری عمر اپنی استطاعت و توفیق کے مطابق اسے دیتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ معروف جہیز نہیں ہوتا۔ وہ عرصہ دراز تک کسی مجبوری کی وجہ سے اس کی شادی نہ کر سکیں جب بھی اسے کچھ نہ کچھ دیتے ہی رہتے ہیں۔

لیکن اسے جہیز تو نہیں کہتے۔

بس حضورؐ نے ایک الگ گھر بسانے کے لئے جو کچھ بھی جناب فاطمہؓ کو دیا اس کو جہیز سمجھنا ایک ایسی غلطی ہے جس کے حق میں کوئی معقول دلیل نہیں نظر آتی۔ حضورؐ نے کبھی کسی موقعے پر بھی والدین کو اپنی بیٹی بیاہنے کے لئے جہیز دینے کا حکم یا کوئی ترغیب نہیں دی۔ سنت نبویؐ میں تو یہ اصطلاح ہی کبھی نہیں رہی یہ سارے پھندے ہم نے خود ہی اپنی گردن میں ڈال کر اپنے لئے مشکلات پیدا کر لی ہیں جن سے سوشل زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ اور شادی بیاہ کی آسانیاں مصیبتوں کے پہاڑ میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ جو سہولتیں ہیں وہ خدا اور رسولؐ کی طرف سے ہیں اور جو دشواریاں اور مشکلات ہیں وہ خود ہی اپنی لائی ہوئی ہیں۔ جہیز کی فکر میں گھل گھل کر مرنا اور اس فکر کی وجہ سے دختروں کو ایک مصیبت سمجھنا کوئی اسلامی شعار نہیں۔ یہ صرف برادران وطن کی کورانہ پیروی ہے جسے اب وہ خود چھوڑ رہے ہیں۔ اور ہم ہنوز اس سے نہ فقط چمٹے ہوئے ہیں بلکہ غضب یہ ہے کہ اسے سنت رسولؐ اور لازمہ ازدواج بھی سمجھے ہوئے ہیں:

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟

بہار، سابق پنجاب اور سابق سرحد کے رواج:

ہندوستان میں صوبہ بہار کے مسلمانوں میں .... اب تک ایک ہندوانہ رسم باقی ہے جسے "تلک" کہتے ہیں۔ تلک کا مفہوم یہ ہے کہ گویا لڑکے کی تجارت ہوتی ہے۔ لڑکا لڑکی والوں سے یہ کہتا ہے کہ تم جہیز میں فلاں فلاں چیزیں دو یا اتنی رقم دو تو میں تمہاری لڑکی سے شادی کروں گا اور بے چارے مسلمان اس خیال سے کہ کب تک لڑکی کو بٹھائے رہیں گے اس کی شرطیں قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ خطبہ نکاح میں تو ہر جگہ یہی ارشاد نبویؐ پڑھا جاتا ہے کہ "**النکاح سنتی ومن رغب عن سنتی فلیس منی**" (نکاح میری سنت ہے اور جو میری سنت سے روگردانی کرے وہ میری جماعت میں نہیں)۔ لیکن اتباع سنت کا یہ انداز بھی قابل داد ہے کہ ساتھ ہی ساتھ "تلک" کی شرط کو بھی منظور کر لیتے ہیں اور جہیز کی "مفروضہ سنت" کو بھی لازمہ ازدواج تصور کرتے ہیں۔ اور سابق صوبہ سرحد میں اس کے بالکل برعکس لڑکی والے لڑکے سے کہتے ہیں کہ اتنے روپے لاؤ تو ہم لڑکی دیں گے۔ پھر وہ اسی رقم کا خاصہ حصہ شادی کے تمام انتظامات میں لگا دیتے ہیں۔ گویا بہار میں لڑکے فروخت ہوتے ہیں اور یہاں لڑکیاں۔

یہ عام قاعدہ ہے کہ جب فروع پر زور دیا جائے تو اصول کی طرف سے بے توجہی ہو جاتی ہے۔ جب غیر ضروری شے کو لازمی تصور کر لیا جائے تو ضروری چیز کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ ایک غیر ضروری چیز جہیز کو لازمہ ازدواج یقین کر لیا تو مہر جیسی ضروری شے محض ایک بے جان، بے اثر اور ناقبل توجہ رسم بن کر رہ گئی۔ جہاں جہاں جہیز پر زور دیا جاتا ہے وہاں آپ دیکھ لیں کہ مہر کی کیا گت بنتی ہے۔ صوبہ بہار میں عام طور پر کم از کم چالیس ہزار روپیہ مع "دو دینار سرخ" دین مہر رکھا جاتا۔ خواہ دولہا چالیس روپے کی بھی سکت نہ رکھتا ہو۔ ایسے مواقع پر دولہا دلہن، نکاح خواں، گواہ، حاضرین، سسرال والے اور میکے والے سب جانتے ہیں کہ یہ زر مہر ساری عمر کبھی ادا نہیں ہوگا لیکن نکاح بڑے ٹھاٹھ سے ہوتا ہے۔ نکاح خواں پوچھتا ہے کہ ...... قبول کیا؟ دولہا جواب دیتا ہے....... جی قبول کیا۔ حالانکہ دونوں ایک دوسرے کے کذب کو سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ غیر ضروری چیز پر زور دینے کا نتیجہ کیا نکلا؟ ضروری غیر ضروری بن گیا۔ چونکہ وہاں مہر کبھی ادا نہیں ہوتا اس لئے وہاں اصطلاح مہر کو کہتے دین مھر یعنی کبھی نہ اترنے والا قرض۔

سابق صوبہ پنجاب میں اس نے ایک دوسری شکل اختیار کر لی۔ یعنی مہر صرف بتیس روپے قرار پائے۔ اور اس کا نام "مہر شرعی" رکھ دیا گیا۔ یعنی اگر اس سے کم زیادہ ہوا تو وہ غیر شرعی مہر ہوگا۔ حالانکہ مہر کا معاملہ صرف اس قدر ہے کہ شوہر آسانی سے ادا کر سکے۔ اور بیوی کے وقار (Status) سے گرا ہوا نہ ہو۔ یہ ایک روپے سے لے کر ایک کروڑ روپے تک ہو سکتا ہے۔

یہ سب نتائج ہیں جہیز کی ہندوانہ رسم کو ضروری سنت قرار دینے کے۔ جب جہیز ضروری ٹھہرا تو مہر خود بخود غیر متوازن ہو گیا۔ جہیز کو لازمہ ازدواج سمجھنے سے مسلمان قوم کے معاشی توازن میں جو بگاڑ پیدا ہوا وہ الگ ہے۔ ہم نے کتنے خاندانوں کو اسی چکر میں مٹتے اور تباہ ہوتے دیکھا ہے۔ وہ محض جہیز کی غیر ضروری رسم پوری کرنے کے لئے سودی قرضہ لیتے ہیں۔ اپنی جائیدادیں رہن رکھ دیتے ہیں جو کبھی واگذار نہیں ہوتیں۔ ادھر مہر کی بڑی رقمیں ادا نہیں ہوتیں اور ادھر جائیداد پر لیا ہوا قرضہ کبھی ادا نہیں ہوتا۔ اور شادی کا فرض قرض کے چکر میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس غیر ضروری رسم کو جو دراصل بدعت ہے ختم کر دیا جائے۔

چھوٹا منہ بڑی بات

(قدرت اللہ شہاب)

نماز

نماز پڑھنے میں کسلمندی، بے رغبتی اور وساوس کے بعد اگلی دشواری خشوع کا مسئلہ تھا۔ قرآن پاک کی سورۃ البقرہ کی آیات نمبر ۴۵ اور ۴۶ میں خشوع کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے: ''اور مدد لو صبر اور نماز سے۔ اور بے شک نماز دشوار ضرور ہے۔ لیکن جن کے قلب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دشوار نہیں۔ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بیشک ملنے والے ہیں اپنے رب سے۔ اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں۔''

اس کے علاوہ سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۲۳۰ میں یہ ہدایت بھی ہے۔ "...... اور (نماز) میں کھڑے ہوا کرو، اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے"

اگرچہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حصول خشوع کا ایسا خوشگوار طریقہ بتا دیا ہے جسے اختیار کرنے سے عبادت میں بھی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود عملی سطح پر یہ سوال مجھے کافی عرصہ تک پریشان کرتا رہا کہ نماز میں خشوع کیسے حاصل ہو؟ اس کی وجہ میرے اعتقاد کی کمزوری نہیں بلکہ میری استعداد کی کمی تھی۔

خشوع کا مقصد سکون قلب ہے۔ قلب میں سکون اسی وقت ہوتا ہے جبکہ اس میں افکار یا وساوس حرکت نہ کریں۔ دل میں افکار اور وساوس کی حرکت کو روکنا بڑی حد تک ایک اختیاری امر ہے۔ اس اختیار کو استعمال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک محمود شے کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اس سے دوسری غیر محمودہ حرکات خود بخود بند ہو جائیں گی۔ اس سے یکسوئی ہو جاتی ہے مثلاً یہ تصور کر لے کہ خانہ کعبہ سامنے ہے۔ اگر نماز کے الفاظ کی طرف توجہ کرنا آسان ہو تو یہ کر لے یا معانی کی طرف توجہ کرے۔ یا اگر حق تعالیٰ کی ذات کی جانب توجہ ہو سکے تو یہ سب سے اعلیٰ ہے۔ توجہ کو اس طرح ادل بدل کرنے میں زیادہ کھود کرید نہ کرے، معتدل توجہ کافی ہے۔ اگر اس درجہ کے ساتھ دوسرے وساوس اور خیالات بھی آتے ہیں تو مضر نہیں کیونکہ وہ غیر اختیاری ہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے آنکھ سے کسی کتاب میں کسی خاص لفظ کو قصداً دیکھیں تو اس کے ساتھ اس

کے آس پاس کے کئی دوسرے الفاظ پر بھی نظر پڑ جاتی ہے۔ مگر چونکہ یہ نظر قصداً نہیں اس لئے یہی کہیں گے کہ فلاں خاص لفظ دیکھا دوسرے الفاظ کو خود نہیں دیکھا بلکہ نظر آ گئے۔ جس طرح یہ انتشار شعاع بصر میں ہوتا ہے اسی طرح بصیرت میں بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ارادہ تو ایک خاص چیز کا ہوتا ہے مگر بلا ارادہ دوسری چیزوں پر بھی نگاہ بصیرت جا پڑتی ہے۔ اس میں کوئی ہرج نہیں کیونکہ اس سے خشوع میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ ہم جیسے عامیوں کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ خواص کے معیار الگ ہوں تو دوسری بات ہے ہمارا ان کا کیا مقابلہ!

یہ بعض ابتدائی مراحل ہیں جو بسا اوقات بڑے کٹھن محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن آسانی اسی میں ہے کہ اگر عمل کے اعلیٰ درجہ پر قدرت نہ ہو سکے تو اس کے ادنیٰ درجہ پر ہی عمل کرے۔ اعلیٰ کے قادر ہونے کے انتظار میں نہ رہے کیونکہ خطرہ ہے کہ تمام عمر اسی انتظار میں گزر جائے اور ادنیٰ سے بھی محروم رہے۔

اللہ کا نام اعلیٰ طریقہ پر لیا جائے یا ادنیٰ طور پر، اپنا اثر ضرور رکھتا ہے۔ دنیا میں بعض اشیاء ایسی ہیں کہ ان کا نام لینے سے ہی منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کا نام لیا جائے اور اس میں اثر نہ ہو؟ خود خالی نام میں بھی برکت ہے خواہ پوری توجہ سے لیا جائے یا کم توجہ سے۔

نماز میں کاہلی و کسلمندی، بے ذوقی و بے رغبتی، وساوس اور پریشان خیالی اور خضوع و خشوع کے ابتدائی مراحل کسی حد تک طے کر لینے کے بعد اس کا اصلی جو ہر رسوخ میں مضمر ہے۔ دنیاوی معاملات میں تو اثر و رسوخ کا مقصد کوشش کی بجائے سفارش کے ذریعہ اپنا کام نکالنا ہوتا ہے۔ لیکن دین میں اس اصطلاح کا مطلب کچھ اور ہے۔ نماز کا مقصد قلب کی توجہ کو اللہ کی جانب راسخ کرنا ہے۔ اگر مستقل کوشش اور مجاہدوں کے ذریعہ یہ نوبت آ جائے کہ رفتہ رفتہ نماز بلا تکلف پڑھنے کی عادت پڑ گئی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اب اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسی نہ کسی درجہ میں رسوخ حاصل ہو گیا ہے۔ رسوخ حاصل کرنے کے لئے اپنے بہت سے طبعی میلانات اور رجحانات کے خلاف مجاہدہ کرنا لازمی ہے۔ مثلاً کاغذ کو لپیٹ کو مروڑ دیں تو اس میں خم پڑ جاتا ہے۔ سیدھا کرنا چاہیں تو اس کا برعکس کریں یعنی اس کو الٹا موڑیں دوسری طرف مروڑے بغیر سیدھا نہیں ہوتا۔ یہی مثال انسان کی طبیعت کی ہے۔ کام میں لگنا چاہیے یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ کیفیات بھی ہیں یا

نہیں۔ حظوظ ولذائذ بھی ہیں یا نہیں۔ اور نہ یہ جانچنے کی ضرورت ہے کہ رسوخ کی جانب کچھ ترقی ہوئی یا نہیں۔ اگر ایک بچہ ہماری نظروں کے سامنے نشو ونما پا رہا ہو تو ہمیں لحہ بہ لحہ یا روز بروز یا ہفتہ بہ ہفتہ یا ماہ بہ ماہ ہرگز یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ جسمانی طور پر کتنا بڑھ گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی بالیدگی رکی ہوئی ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے ہر روز تو ہمیں اس کا کچھ احساس نہیں ہوتا لیکن ایک خاص وقت گزرنے کے بعد بچے کا بڑھا ہوا قد کاٹھ صاف طور پر ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ یہی حال رسوخ کا ہے روز کے روز تو ہمیں اس کی ترقی یا تنزل کا کچھ علم نہ تو ہوتا ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے لیکن رفتہ رفتہ جب اپنی طبعی اور نفسانی اور نفسیاتی رکاوٹوں کے باوجود نماز کا فریضہ روزمرہ کے بندھے بندھائے معمول کے مطابق ادا ہونا شروع ہو جائے تو گمان کر لینا چاہیے کہ اگر ہم رسوخ کی شہر پناہ میں نہیں تو کم از کم اس کے پھاٹک پر ضرور کھڑے ہیں۔ لیکن یہاں پر بھی نماز میں کسی خاص کیفیت وجدانی کیفیت یا استغراقی لطف و سرور کی تلاش میں سرگرداں نہ ہو۔ نماز صحیح طور پر ادا کرنا فرض ہے، اس سے لطف یا حظ اٹھانا فرض نہیں۔ نماز اللہ کے لئے پڑھی جاتی ہے لطف و سرور کا مزا اٹھانے کے لئے نہیں۔ عارفین نے تو عبادت کی لذت کے قصد سے بھی پناہ مانگی ہے۔ اگر ساری عمر گزر جائے اور کوئی لذت ان کو نہ آئے وہ اس پر بھی خوش رہتے ہیں۔

رسوخ کا حصول ایک اختیاری امر ہے جو انسان کے اپنے ارادہ سے ہوتا ہے۔ شروع ہی میں اس ارادہ کی نیت کر لینا کافی ہے جب تک اس ارادہ کے برعکس یا برخلاف کوئی عمل سرزد نہ ہو وہ آخر تک لازماً قائم اور برقرار رہتا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ کوئی شخص لائبریری جانے کے لئے نکلا تو کیا وہ ہر قدم پر لائبریری کی جانب چلنے کا ارادہ کرے گا؟ ہرگز نہیں بس ایک ہی مرتبہ کا ارادہ کافی ہوتا ہے۔ اسی کے اثر سے لائبریری کی طرف برابر قدم اٹھتا رہے گا۔ اب وہ چل بھی رہا ہے اور کسی سے بات بھی کر رہا ہے، یا کتاب یا اخبار بھی دیکھ رہا ہے۔ اس وقت چلنے کی طرف تو اس کا مطلق دھیان نہیں ہوتا۔ لیکن قدم لائبریری کی طرف اٹھتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوشش اور مجاہدہ سے عبادت کے ساتھ کسی قدر لگن اور لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے تو طبعی طور پر افعام صالحہ صادر ہونے لگتے ہیں۔ زیادہ اہتمام اور مشقت کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر عبادت یا نماز کا مجاہدہ کسی دنیاوی غرض سے نہ کیا جائے، بلکہ اس ارادہ سے کیا جائے کہ بے تکلف افعال صالحہ کا صدور

ہونے لگے تو وہی مشقت ہر ہر فعل کی معاون و مددگار ہو جائے گی اور رسوخ کامل کا راستہ وا ہو جائے گا۔ یہی استقامت سب سے بڑی کرامت ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رضا کا سایہ ہر وقت چھایا رہتا ہے۔ ایسے لوگ مستجاب الدعوات ہوتے ہیں یعنی ان کی اکثر دعائیں قبول ہوتی ہیں، ان کا ارادہ بھی دعا بن جاتا ہے، ان کی خواہش بھی دعا ہوتی ہے۔ چونکہ ان کی اپنی خواہشات کا دائرہ سمٹ سمٹ کر صفر کے برابر ہو گیا ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی دعائیں ان کے ارادے اور ان کی خواہشیں زیادہ تر دوسروں کے لئے ہوتی ہیں جن پر قبولیت کا فضل وارد ہوتا ہے۔ اپنی ذات کے لئے ان کی صرف ایک ہی دعا اور خواہش ہوتی ہے۔ وہ حسن خاتمہ کی ہوتی ہے۔

یہ سارا معجزہ روٹین (Routine) اور صرف روٹین (Routine) کی برکت سے رونما ہوتا ہے۔ عرف عام میں تو روٹین کا لفظ کسی قدر غیر ترقی یافتہ، سادہ، ان گھڑ، جامد اور کسی قدر غیر مہذب معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً تخلیقی اپچ سے عاری انسان کو جو کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں چکر کاٹتا رہے مذاقاً روٹین کا آدمی سمجھا جاتا ہے۔ روز بروز ایک ہی طرح کی مشقت بار بار دہرانے کو روٹین کا نام دے کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ جس عمل میں رنگ برنگی گونا گونی اور بوقلمونی کی چاشنی نہ ہو اسے بھی روٹین کے کھاتے میں ڈال کر حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن باطن کی دنیا میں دین کا شیش محل روٹین کی بنیاد پر تعمیر ہو سکتا ہے، ہر روز مقررہ اوقات میں مقررہ رکعتوں والی نمازیں بلاناغہ پڑھنا روٹین نہیں تو اور کیا ہے؟ ہر نماز کی ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھنا، اور رکوع و سجود میں وہی کلمات بار بار دہرانا اس سے بڑی روٹین ہے۔ نماز کے علاوہ جو افراد ذکر، شغل اور مراقبہ کے میدان میں بھی قدم رکھنا چاہتے ہیں، ان کی روٹین کی بھی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا۔ اسمائے الٰہی میں سے ایک ہی اسم، یا نفی اثبات میں کلمہ طیبہ یا دیگر کلمات کو سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں بار دہرانا، اور اس کا ذکر، شغل یا مراقبے کو حتی الوسع ایک ہی مقررہ اوقات میں ایک ہی مقررہ مقام پر بیٹھ کر پابندی سے نبھانا روٹین کا ایک ایسا درجہ ہے جہاں پر اس کا وجود محض تکراری نہیں رہتا بلکہ تخلیقی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ ذکر و شغل اور مراقبہ میں ہر روز ایک ہی مقام اور ایک ہی وقت متعین کرنے میں ایک نہایت باریک، لطیف اور نازک رمز پوشیدہ ہے۔ مثال کے طور پر ایک تالاب ہے جس میں بہت سی مچھلیوں کا بسیرا ہے۔ اگر کوئی شخص ہر روز ایک ہی مقررہ وقت پر تالاب کے ایک خاص کونے پر کھڑا ہو کر مچھلیوں کی کوئی پسندیدہ خوراک

ڈالتا رہے، تو رفتہ رفتہ تالاب کی تمام مچھلیاں اس مخصوص وقت اور مقام پر جمع ہونا شروع ہو جائیں گی۔ بعض اوقات تو وہ وقت سے پہلے ہی اس خاص کونے میں جمع ہو کر اپنی پسندیدہ خوراک کے انتظار میں منڈلانا شروع کر دیں گی۔ لیکن اگر کسی روز وہ شخص کسی دوسرے وقت پر آ کر اسی تالاب کے کسی دوسرے کونے میں وہی خوراک ڈالے تو چند مچھلیاں تو ضرور آ جائی گی لیکن باقی سب محروم رہیں گی۔ اسی طرح اگر ہر روز وقت اور مقام ادلتے بدلتے رہیں تو بھی یہی ادھوری کیفیت رہیگی تالاب کی مچھلیوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنی طرف کھینچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ان کی دلپسند اشیاء کو ہر روز ایک خاص مقررہ وقت اور مقام پر ڈالتے رہیں۔ اسی طرح ذکر، شغل اور مراقبہ کے دوران بھی ایک ہی خاص جگہ اور وقت مقرر کرنے سے فضائی بسیط میں پھیلے ہوئے بے شمار رحمانی اور ملکواتی اثرات کو اپنی جانب منعطف کرنے میں بڑی سہولت ملتی ہے۔

البتہ اس مثال کا اطلاق نماز پر نہیں ہوتا۔ نماز کی فضیلت با جماعت ادا کرنے میں ہے اس اجتماعی عبادت میں اوقات کا تعین تو لازمی ہے لیکن مسجد میں اپنے لئے ہمیشہ ایک ہی جگہ پر قابض رہنے کی کوشش کرنا نامناسب اور غیر واجب ہے۔

نسبت

نماز میں رسوخ کے بعد اگلی منزل اللہ کے ساتھ نسبت قائم کرنے کی ہے۔ نسبت ایک لگاؤ اور تعلق کا نام ہے جو دونوں طرف سے ہوتا ہے۔ بندہ کو خدا سے اور خدا کو بندہ سے، اسے نسبت باطنی کہتے ہیں۔ رسوخ میں جس قدر ثبات اور توانائی بڑھے گی، نسبت میں اسی رفتار سے استحکام اور لطافت کو فروغ حاصل ہوگا۔ باطنی نسبت معرفت الٰہی کا دریچہ ہے۔ حقیقی نسبت کی پہچان یہ ہے کہ حاصل ہونے کے بعد پھر زائل نہیں ہوتی۔ جیسے پھل پک کر کچا نہیں ہوتا، یا انسان بالغ ہو کر نابالغ نہیں ہوسکتا۔

قرآن حکیم کی سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۲۵۷ میں ارشاد ہے۔....... "جو شخص شیطان سے بداعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اعتقاد ہو۔ تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا۔ جس کو کسی طرح کی شکستگی نہیں.........." اس میں صاف دلیل ہے اس بات پر کہ نسبت مع اللہ حصول کے بعد منقطع اور شکستہ نہیں ہوتی۔

نسبت کا تعلق اگرچہ باطن سے ہے لیکن باطن خلاء میں پرورش نہیں پاتا۔ بلکہ انسان کے ظاہر کی چاردیواری میں مقید ہوتا ہے۔ انسان کا ظاہر اور باطن ایک ہی گاڑی کے دو پہیئے ہیں۔ اگر دونوں پہیوں

کی جسامت، ناپ، سائز، گولائی اور صفائی برابر اور یکساں نہ ہوگی تو گاڑی اصل منزل مقصود پر ہرگز نہ پہنچ پائے گی۔ اصل منزل مقصود حق تعالیٰ کا راضی کرنا ہے جس کا ذریعہ شریعت کے احکام کی پابندی ہے۔ ان احکام میں بعض ظاہر کے متعلق ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، لین دین، شہادت، وصیت، وراثت اور دیگر جملہ حقوق العباد اور بعضے باطن کے متعلق ہیں۔ جیسے حب الٰہی، حب رسولؐ، خوف خدا، یاد خدا، تقویٰ اور توکل کو اپنانا، اور تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کے علاوہ کبر، عجب، شک، منافقت، حسد، ریاء، مکر، فریب، جھوٹ اور غیبت جیسے بے شمار مہین مہین رذائل سے نجات پانا ہے۔

سورۃ الانعام کی آیت ۱۲۰ میں ارشاد ہے۔ ''اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑ دو...''

عبدیت اور تصوف

اپنے ظاہر اور باطن کو شریعت کی راہ پر توازن اور اعتدال سے چلانے ہی سے عبدیت کا سفر طے ہوتا ہے۔ اگر عبدیت میسر ہو جائے تو ولایت، اوتادیت، ابدالیت، قطبیت، غوثیت وغیرہ سب اس پر قربان ہیں۔

ایک غلط فہمی یہ عام ہے کہ یہ تصوف کے مسائل ہیں۔ دراصل یہ تصوف کے نہیں بلکہ شریعت کے مسائل ہیں۔ دین کی اصلی شاہراہ شریعت ہے۔ تصوف کے سارے سلسلے چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں ہیں جو اپنے اپنے طریق سے انجام کار شریعت کی شاہراہ سے جا کر مل جاتی ہیں۔ ان پگڈنڈیوں کی اپنی کوئی الگ منزل نہیں۔ ان سب کی مشترکہ اور واحد منزل مقصود شاہراہ شریعت تک پہنچانا ہے۔ اس شاہراہ پر مزید سفر کرنے سے وہ راہ سلوک طے ہوتی ہے جس کا مقصد نسبت باطنی، نسبت مع اللہ، معرفت الٰہی اور رضاء الٰہی کا حصول ہے۔

کچھ لوگ ہمت مردانہ رکھتے ہیں اور خود بخود راہ شریعت پر گامزن ہو کر زندگی کا سفر بغیر کسی تکان، ہیجان اور خلجان کے پورا کر لیتے ہیں۔ ان کی خوش قسمتی قابل رشک ہے اور انہیں دلی عزت واحترام سے سلام کرتا ہوں۔

لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جن کے قدم شریعت کی راہ پر رواں ہونے سے ہچکچاتے اور ڈگمگاتے ہیں جس طرح کچھ بچے سکول میں داخل ہونے کے بعد پڑھنے سے گھبراتے اور کتراتے ہیں۔ ان کے علاج کے لئے تعلیمی ماہرین نے کنڈر گارٹن (Kindergarten) اور مونٹیسوری (Montesori) سکول ایجاد کئے۔ جن میں بچوں کو کھیل کود اور کھلونوں وغیرہ سے بہلا پھسلا کر پڑھنے لکھنے سے مانوس کیا

جاتا ہے۔ یہ صرف چھوٹی جماعت کے سکول ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچوں کا رجحان لکھنے پڑھنے کی طرف مائل کر کے دے۔ انہیں معاشرے کے عام تعلیمی نظام میں شامل کر دیں۔ تصوف کے سلسلے بھی ایک طرح کے کنڈر گارٹن اور مونٹیسوری سکولوں کی مانند ہیں جو شریعت سے بھٹکے ہوئے بندوں کو طرح طرح کے اذکار، اشغال اور مراقبات کے انوار و آثار و تجلیات و برکات سے چکا چوند کر کے انہیں شاہراہ شریعت پر خوشدلی سے گامزن ہونے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ تصوف کا اور کوئی مقصود نہیں۔

ابتداء میں میرا اپنا شمار بھی ان تن آسانوں میں تھا جو شریعت کے نظم و ضبط کی بندشوں سے بری طرح گھبراتے تھے۔ اس زمانے میں اردو ادب میں آزاد نظم کا اسلوب نیا نیا وارد ہوا تھا۔ اپنی کوتاہ اندیشی اور حماقت سے کچھ عرصہ تک میں اس خام خیالی میں مبتلا رہا کہ جس طرح قافیہ اور ردیف کے بغیر چھوٹے بڑے مصرعوں میں بحر، وزن اور عروض کی ظاہری، ناہمواریوں کے باوجود ایک نظم شاعری کے فن میں شامل سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح فقط نماز اور روزہ نبھا کر اور شریعت کی باقی تمام بندشوں سے آزادی اختیار کر کے مجھے ایک اچھا مسلمان تسلیم کئے جانے کا حق بھی حاصل ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ان دنوں ابھی نثری نظم کا چرچا شروع نہ ہوا تھا۔ ورنہ شاید میں نماز اور روزہ کی شرط بھی اڑا دیتا۔

لیکن ایک بار پھر میری خوش قسمتی آڑے آئی۔ اتفاق سے حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کی تصنیف "عوارف المعارف" کہیں سے میرے ہاتھ آ گئی۔ بے حد دقیق کتاب تھی میں نے اسے کئی بار پڑھا، لیکن کچھ پلے نہ پڑا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ میری سوچ کے ظلمت کدے میں ایک نیا روشندان کھل گیا۔ اس کے بعد میں نے حضرت غوث الاعظمؒ سے لے کر مولانا اشرف علی تھانویؒ تک درجنوں ایسی کتابیں کھنگال ڈالیں جو ان بزرگان شریعت و طریقت کی تصانیف تھیں یا دوسروں نے ان کے حالات یا ملفوظات یا تعلیمات قلمبند کر رکھی تھیں۔ اس علمی ذخیرہ نے مجھے طریقت کے چاروں بڑے سلسلوں اور ان کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے ضمنی سلسلوں کے بارے میں کافی آگاہی بخشی۔ لیکن ساتھ ہی ایک الجھن بھی میرے دل میں پیدا ہو گئی یہ الجھن تلاش مرشد تلاش شیخ کے بارے میں تھی۔ طریقت کے سارے سلسلوں میں ایک بات مشترک تھی۔ وہ یہ کہ اس راستے پر قدم اٹھانے سے پہلے کسی مرشد کو اپنا رہنما بنانا لازمی ہے۔ (جاری ہے)

عبادات

(خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ)

حج:

اسلامی عبادات میں حج بھی ایک بے مثال اور مفید ترین عبادت ہے۔ حج صرف اس کا نام نہیں کہ مکہ معظمہ پہنچے طواف کیا اور دوسرے مناسک حج ادا کر کے جیسے کوری گئے تھے ویسے ہی واپس چلے آئے اور سمجھ لیا کہ ہمارے سب اگلے پچھلے گناہ معاف ہو گئے اور جنت کا پروانہ مل گیا۔ بلکہ حج سے مندرجہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

۱۔ حج میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ اور سفر سے حوصلہ عقل اور تجربہ بڑھتا ہے، جھجک دور ہوتی ہے، معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲۔ سفر میں جو صعوبتیں اور تکالیف پیش آتی ہیں ان کو ایک فریضہ مذہبی کی ادائیگی کے خیال سے بخوشی برداشت کرنا پڑتا ہے جس سے تکلیفیں اٹھانے کی عادت پیدا ہوتی ہے اور قوت برداشت بڑھتی ہے۔

۳۔ چونکہ اکثر اوقات آدمی اکیلا ہی جاتا ہے اور ہر کام کے لئے خود اپنے ہی اوپر بھروسہ کرنا پڑتا ہے اس سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ جو اعلیٰ کردار انسانی پیدا کرنے کے لئے بہت ہی ضروری صفت ہے۔

۴۔ سستی اور کاہلی رفع ہوتی اور قوت عمل پیدا ہوتی ہے۔

۵۔ انسان جب حج کو جانے کا ارادہ کرتا ہے تو حضور رسالتمآبؐ کے روضہ پر حاضری کی تمنا بھی ضرور ہوتی ہے اس لئے وہ تمام گناہوں سے توبہ کر لیتا اور پاک صاف دل لے کر جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جو عمر بھر اس توبہ پر قائم رہتے ہیں اور نیک مرتے ہیں یہ بہت بڑی بات ہے۔

۶۔ چونکہ دوران سفر میں دل نیکی اور محبت کے جذبات سے معمور ہوتا ہے۔ ہر آدمی دوسرے ہمراہیوں کی مدد کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمدردی اور خدمت کا جذبہ ترقی پاتا ہے۔

۷۔ حج نیکی اور بدی کی کسوٹی ہے۔ جو لوگ محض دنیا دکھاوے کے لئے حج کرتے ہیں یا اپنی بدیوں کو حج کے مقدس پردے میں چھپانا چاہتے ہیں وہ واپس آ کر پہلے سے بھی زیادہ فسق و فجور

میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے جو لوگ سچ مچ نیک ہوتے ہیں واپس آنے کے بعد سب پر ان کی نیکیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔

۸۔ حاجی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں پرانے اماکن مقدسہ اور تاریخی مقامات کو دیکھتا اور قبور صحابہؓ وغیرہ کی زیارت کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے ابتدائی تاریخ اسلام کی واقفیت پیدا ہوتی ہے اور دل میں ترقی ملت کا جذبہ اور جوش پیدا ہوتا ہے اور اگر دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو تو وہ جوش و جذبہ مستقل ہو جاتا ہے۔

۹۔ حاجی حضورؐ سرکار دو عالم کے روضہ اقدس پر بھی حاضر ہوتا ہے اور آپ کی سچی محبت اور فیض روحانی سے مالا مال ہو کر واپس آتا ہے۔ اس نعمت کا مقابلہ اور کوئی چیز بھی نہیں کر سکتی۔

۱۰۔ کعبۃ اللہ تمام ملت اسلامیہ کا مرکز ہے۔ شمال جنوب، مشرق مغرب ہر طرف کے مسلمان اسی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ اس لئے کعبہ کی جو عظمت و بزرگی مسلمانوں کے دل میں ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں وہ امیر ہوں یا غریب، نیک اور پارسا ہوں یا گنہگار اور فاسق و فاجر، کعبہ کی حفاظت و دفاع کے لئے بے تامل اپنا جان و مال اور آل و اولاد قربان کر سکتے ہیں۔ اسی کعبہ کے طواف کو ہر سال ہزار ہا مسلمان اطراف عالم سے اکٹھے ہوتے ہیں۔ اگر ہمارے مذہبی اور سیاسی رہنما تھوڑے سے خلوص اور محنت سے کام کریں تو یہاں ایک ایسا مرکز قائم ہو سکتا ہے۔ جس سے تمام دنیا کے مسلمانوں میں ارتباط و تعلق پیدا کر کے ان کی عالمگیر تنظیم کی جا سکتی ہے۔ یہ کام کچھ بھی مشکل نہیں ایک دن ہوگا اور ہو کر رہے گا۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ یہ سعادت کس کی قسمت میں لکھی ہے۔

زکوٰۃ:

اور عبادات کی طرح زکوٰۃ بھی ایک ایسی مفید عبادت ہے جس کی مثال دنیا کا اور کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ زکوٰۃ میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اجتماعی فوائد انفرادی فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں:-

۱۔ زکوٰۃ دینے والوں میں ہمدردی، ایثار اور خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو قومی بقا کے لئے ناگزیر ہے۔

۲۔ اگر ہمارے امراء زکوٰۃ نکالتے اور اس کے ساتھ ہی خیرات بھی کرتے رہیں۔ جس کا

قرآن میں جا بجا حکم دیا گیا ہے۔ تو ہماری قوم میں روپیہ کی تقسیم اس طرح ہو سکتی ہے کہ نہ تو کوئی اتنا مالدار بن سکتا جتنے کہ یورپ امریکہ اور ہندوستان کے سرمایہ دار، نہ اس قدر غریب رہ سکتا ہے کہ کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑا اور سر چھپانے کو جھونپڑا تک نہ ہو۔ اسلام نے دولت کی تقسیم کا یہ طریقہ جو رکھا ہے عملی ہے۔ کمیونزم میں دولت کی تقسیم کا جو قاعدہ ہے اگر چہ بظاہر بڑا دلپسند ہے لیکن عملی وفطرتی ہرگز نہیں یہ طریقہ کچھ عرصہ تک طاقت کے زور سے قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ جو قانون اور قاعدے صرف ڈنڈے کے بل بوتے پر نافذ کئے اور جاری رکھے جاتے ہیں ان کی بنیاد ریت پر ہوتی ہے۔ برخلاف ازیں جو قانون اور قاعدے عوام کی رضا اور خوشی پر قائم کئے جاتے ہیں ہمیشہ دیر پا ہوتے ہیں۔ عوام میں سے فطرتاً اور طبعاً کوئی بھی برضا و رغبت اس بات کو نہیں مان سکتا کہ دن رات محنت اور خون پسینہ ایک کر کے جو کچھ کمائے گورنمنٹ کے حوالے کر دے جس سے بڑے بڑے افسر تو مزے اڑائیں اور وہ معمولی روٹی کپڑے پر گزارہ کرتا رہے۔

۳۔ ہمارے ہاں زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ انفرادی ہے۔ جو شخص زکوٰۃ نکالتا ہے وہ اپنی مرضی سے جس کو مستحق سمجھتا ہے دے دیتا ہے۔ اگر چہ یہ بات بھی بہت اچھی ہے۔ لیکن اگر ہر اسلامی ملک میں ایک بیت المال بنایا جائے اور تمام ملک کی زکوٰۃ کا روپیہ اس میں جمع کر کے انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی ضرورتوں پر خرچ کیا جائے تو چند ہی سال میں قوم نہ صرف اقتصادی بلکہ اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے بھی ترقی کے چرخ چہارم پر پہنچ سکتی ہی۔

۴۔ انفرادی فوائد یہ ہیں کہ مستحق غریبوں اور محتاجوں کو فرداً فرداً اتنی مدد دی جا سکتی ہے کہ انہیں بھیک نہ مانگنا پڑے۔ یہی نہیں بلکہ ان کو ایسی مدد بھی دی جا سکتی ہے جس سے وہ اپنے گزارے کا کوئی مستقل ذریعہ قائم کر لیں۔ اور آئندہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے افلاس اور دریوزہ گری سے مامون ومحفوظ ہو جائیں۔

۵۔ سڑک پر پڑے ہوئے اندھوں، لنگڑے لولے محتاجوں اور اپاہجوں کے لئے محتاج خانے قائم کیے جا سکتے ہیں۔ اس سے دوگنا فائدہ ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان اپاہجوں کی زندگی آرام سے گزرے گی۔ دوسرے یہ کہ بیرونی مہذب ممالک کے باشندے بازاروں اور شاہراہوں پر ان محتاجوں اور اپاہجوں کے لشکر کو دیکھ کر ہمارے متعلق جو حقارت آمیز خیال قائم کر لیتے ہیں نہ کر

سکیں۔ اور ہمارے قومی وقار کو ٹھیس نہ لگے گی۔ تیسرا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہمارے آوارہ اور کاہل نوجوانوں کے دل میں ان گداگروں کو دیکھ کر جو بے محنت ومشقت رزق پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوسکتا ہے نہ ہو سکے گا۔

۶۔ یتیم خانے قائم کیے جاسکیں گے اور قوم کے ہزاروں قابل دماغ بچے جو بے یارو مددگار ہونے کی وجہ سے غربت و ذلت کی زندگی بسر کرتے کرتے برباد ہو جاتے ہیں۔ تباہی سے بچ جائیں گے اور قوم کے اچھے شہری ثابت ہوں گے۔

۷۔ ہونہار طلباء کو جو غربت کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم سے محروم رہتے ہیں وظیفے دے کر اعلیٰ تعلیم دلائی جاسکے گی۔

۸۔ قرضہ کے فکر سے انسان ہمیشہ پریشان رہتا ہے اور اس کی قوت عمل دماغی کوفت کی وجہ سے مفلوج ہو جاتی ہے۔ لیکن زکوٰۃ کا روپیہ چونکہ قرض نہیں دیا جاسکتا امداد دیا جائے گا۔ اس لئے لینے والوں کے سر پر کوئی بوجھ نہ رہے گا اور وہ بے فکری سے کام کرسکیں گے۔

۹۔ قوم میں غربت کے فقدان سے جو عام امنگ اور اپچ ترقی کے لئے پیدا ہوتی ہے وہ بڑی آسانی سے عوام میں پیدا ہو جائے گی۔

۱۰۔ بیت المال کے روپیہ سے ایسے مجاہدین کے اہل وعیال کی کفالت ہوسکے گی جو میدان جنگ میں شہید ہوں یا قوم کے لئے کوئی دوسرا خطرناک کام کرتے ہوئے مر جائیں یا مارے جائیں۔ مسلمانوں میں اسلامی عزت و وقار کے لئے خطرناک کام کرنے اور میدان جہاد میں جان قربان کر دینے والوں کی ہرگز کمی نہیں۔ کونسا مسلمان ہے جو رسول کریمؐ سے محبت نہیں کرتا اور حضورؐ کی امت یا حضورؐ کی تعلیم کو تباہی سے بچانے کے لئے جان قربان نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ خیال کہ ہمارے بعد بال بچے کیا کریں گے ایسی رکاوٹ ہے جو بڑے سے بڑے بہادروں کے پاؤں میں زنجیر ڈال دیتی ہے اس لئے جب ان کو یقین ہو جائے گا کہ مرنے کے بعد ہمارے پسماندگان کو کوئی تکلیف نہ ہوگی تو یقیناً کسی مسلمان کو بھی شہادت جیسی نعمت حاصل کرنے میں تامل باقی نہ رہے گا۔

اکثر علمائے دین کی رائے ہے کہ زکوٰۃ کا روپیہ حکومت کے نظم ونسق اور ترقیات کی دوسری مدوں پر خرچ نہیں کیا جاسکتا۔ صرف غریبوں اور محتاجوں کی مدد کے لئے ہی دیا جاسکتا ہے۔ ان

بزرگوں کی توجہ ہم اپنے مندرجہ بالا نکات کی طرف خاص طور سے مبذول کراتے ہیں کہ یہ تمام مدات ایسی ہیں جن میں صرف غریبوں اور محتاجوں ہی پر روپیہ خرچ کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انفرادی طور پر بے قاعدہ اور بے ڈھنگے طور سے خرچ ہوتا ہے بیت المال کے ذریعہ باقاعدہ اور زیادہ مفید طور پر خرچ ہو سکے گا۔

جہاد :

جہاد بھی اسلام کی ایک عدیم النظیر عبادت ہے۔اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ناممکن ہے دوسری تمام عبادتوں سے مسلمانوں میں جو اخلاقی خوبیاں اور قوتیں پیدا ہوتی ہیں اور جو کردار بنتا ہے جہاد ان سب کی کسوٹی اور امتحان ہے۔اگر دوسری عبادتیں انفرادی اور اجتماعی تعمیر کے لئے ہیں۔تو جہاد اس تعمیر کو قائم اور باقی رکھنے کے لئے ہے۔اور عبادتیں اگر زندہ رہ کر کی جاتی ہیں تو یہ جان دے کر ادا ہوتی ہے۔ جب تک جہاد کی روح زندہ رہی مسلمانوں کے تمام مخالف لرزہ براندام رہے۔ جب یہ روح مرگئی قوم بھی مرگئی۔ یہ روح کیوں مری؟ ایمان کی کمزوری، عبادات سے تغافل، قرآن سے بے اعتنائی اور چاردن کی زندگی کے عشق سے۔دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ مذہب اور تعلیم قرآنی کی طرف سے بے پروائی اور حالات جہان سے بے خبری کے سبب پیروان اسلام اس پروپیگنڈے کا شکار ہوگئے جو صدیوں تک یورپ اور بالخصوص انگریز کی طرف سے مسلمانوں میں مذہب اسلام اور خصوصاً جہاد کے خلاف بڑے زور وشور سے ہوتا رہا۔اس پروپیگنڈے کا نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ مسلمان غیر مسلموں کو بنوک شمشیر اسلام لانے پر مجبور کرتے ہیں اور جو کوئی انکار کرتا ہے اسے تہ تیغ کر دیتے ہیں اسی کا نام جہاد ہے اور یہ بات پرلے درجہ کی وحشت و بربریت اور ننگ انسانیت ہے۔لطف یہ ہے کہ یہ پراپیگنڈا وہ یورپ اور انگریز کر رہا تھا جو خود دوسو برس تک مذہب کے نام پر مسلمانوں سے صلیبی لڑائیاں لڑتا رہا۔اس پروپیگنڈے کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ تمام دنیائے عیسائیت کو مسلمانوں کے خلاف میدان جنگ میں اکٹھا کر دیا جائے۔لیکن بعد کی صدیوں میں جب مسلمانوں میں مذہب کی طرف سے بہت زیادہ بے پروائی پیدا ہوگئی تو وہ خود اس سے متاثر ہونے لگے اور الزام کا جواب دینے کی بجائے خود جہاد کی افادیت کی طرف سے ہی شک میں پڑگئے نہ صرف یہ بلکہ بہت سے لوگوں نے تو جہاد کے جواز یا فی الوقت ضروری ہونے ہی سے انکار کر دیا۔

اب مسلمانوں کو اگر بہ حیثیت مسلمان زندہ رہنا ہے تو اس روح جہاد کو پھر زندہ کرنا ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے اور دوسری دنیا کو بھی سمجھا دینا چاہیے کہ جہاد غیر مسلم ممالک پر قبضہ جمانے، دولت سمیٹنے، اور مال غنیمت یا عورتیں یا لونڈیاں حاصل کرنے کے لئے ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنی اور اسلامی تعلیم کے مطابق جو مسلمان اس نیت سے جنگ کرتے ہیں ان کو ہرگز جہاد کا ثواب اور مجاہد یا شہید کا مرتبہ نہیں ملتا۔ جہاد کسی حیثیت سے بھی جارحانہ اقدام نہیں۔ بلکہ اس کی حیثیت خالصتاً مدافعانہ ہے۔ سرورِ کائنات کے زمانہ میں جس قدر غزوات یا سریات ہوئے سب کی نوعیت مدافعانہ تھی۔ مختصر جہاد صرف دفاعی جنگ ہے جو صرف اس وقت لڑی جاتی ہے جب کسی اسلامی ملک پر کوئی غیر مسلم طاقت حملہ کر دے یا اپنے ملک میں ایسی تیاریاں کرے جس سے مسلمانوں یعنی اسلام کو خطرہ ہو۔ بہت سے مسلمان یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ اگر دنیا میں ایک بھی مسلمان باقی نہ رہا اسلام تب بھی فنا نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو مسلمان کر دے گا۔ ایسے فقرے یہ لوگ در حقیقت بری نیت سے نہیں کہتے بلکہ مقصود اسلام کی حقانیت جتانا ہوتا ہے۔ لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ کوئی چیز ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی ہے جو اس قسم کے الفاظ ان کے منہ سے کہلواتی ہے۔ یہ چیز ہے ایمان کی کمزوری، اپنے اوپر انتہائی بے اعتمادی، بے عملی، سستی، کاہلی اور دنیائے فانی کے مال و منال اور اہل و عیال کی محبت۔ مومن کبھی ایسا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ وہ تو اسلام کی عزت کو بچانا اپنا فرض اور سعادت سمجھتا ہے اور جب ضرورت ہوتی ہے اس یقین کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتا ہے کہ اللہ کی نصرت اور فتح ہمارے ساتھ ہے اور ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ جب تک مومن اس سطح زمین پر باقی تھے دنیا نے ہزاروں مرتبہ ان کے اس عقیدے پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔

اب رہا غیر مسلموں کا اعتراض تو اس کا ایک جواب تو اوپر دیا جا چکا ہے کہ جہاد ہرگز ہرگز جارحانہ نہیں بلکہ مدافعانہ جنگ کو کہتے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ تم خود کیوں دو سو برس تک مذہب کے نام پر مسلمانوں سے صلیبی لڑائیاں لڑتے رہے ہو۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ اگر مذہب کے نام یا مذہب کے تحفظ کے لئے جنگ کرنا شیوۂ بربریت ہے تو آج بے دین کمیونزم کے خلاف "دیندار" ملکوں کا اتحاد کیوں کرایا جا رہا ہے۔

مقصد تخلیق آدم

(عبدالرشید ساہی)

محترم سامعین آج مجھے اللہ کی توفیق سے مقصد تخلیق آدم کے عنوان پر اظہار خیال کرنا ہے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ اطاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرو بیاں

تخلیق آدم کا مقصد اور نصب العین اخلاقی کمال کا حصول ہے اس سلسلہ میں اللہ رب العزت قرآن حکیم میں ارشاد فرماتے ہیں

"وما خلقت الجن والانس الا لیعبد ون"

"اور وہ یہ کہ میں نے جن اور آدمی صرف اس لئے پیدا کئے ہیں کہ وہ میری عبادت کریں۔"

اس آیت سے بڑی صراحت کے ساتھ انسانی زندگی کا مقصد اور اسکی غرض تخلیق بیان کر دی کہ انسانوں کو پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کی اپنی حاجت کے لئے نہ تھا کیونکہ وہ ذات تو بے نیاز ہے اس ذات نے تمہیں پیدا کیا تو محض اس لئے کہ تم اس کی بندگی کر کے اخلاقی کمال حاصل کر سکو کیونکہ اس کی بندگی کے شعور میں تمہاری ہی مغفرت ہے۔ اور اس کی بندگی اختیار کرنے میں تمہارا ہی کمال ہے۔ نبی مکرمؐ کی ذات گرامی سے ارشاد ہوا کہ قیامت کے روز مومن کے نامہ اعمال میں سب سے وزنی چیز خوش خلقی ہوگی اگر آدمی کو اپنے مقصد تخلیق کا شعور حاصل ہو گیا اور انہوں نے اسے بطور نصب العین اختیار کر لیا تو اس سے وہ با کمال ہو جائیں گے اور یہی اخلاقی کمال ان کے لئے حقیقی کامیابی کا ضامن ثابت ہوگا "عبادت" کے لفظ سے شائد کسی کو یہ گمان پیدا ہو کہ عبادت اور بندگی سے مراد وہی امور ہیں جنہیں عرف عام میں عبادات سے تعبیر کیا جاتا ہے مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ اور انہی عبادات کا بجالانا انسانی زندگی کا نصب العین ہے تو تصور غلط ہے کیونکہ قرآن عبادت اور بندگی کو انسانی تخلیق کا واحد مقصد قرار دے رہا ہے۔

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

اگر عبادات سے مراد صرف نماز ہوتو وہ دن میں صرف پانچ وقت کے لئے فرض ہے بقایا اوقات میں نہیں اگر عبادت سے مراد صرف روزہ ہوتو وہ سال میں ایک ماہ کے لئے فرض ہیں بقایا مہینوں میں نہیں اگر عبادت سے مراد محض زکوٰۃ ہوتو وہ بھی صاحب استطاعت کے لئے سال بھر میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے تو کیا بقایا عمر مقصد حیات سے صرف نظر کرتے ہوئے بسر ہوگی۔ اگر ارکان اسلام کے علاوہ دیگر جملہ عبادات کو بھی شامل کرلیا جائے تو وہ ساری کی ساری مل کر بھی پوری زندگی کے ایک ایک لمحہ پر محیط نہیں ہوسکتیں انسان کھاتا پیتا بھی ہے سوتا جاگتا بھی ہے شادی بیاہ بھی کرتا تجارت اور کاروبار بھی کرتا ہے اور دیگر ہر طرح کے معاملات زندگی بھی نبھاتا ہے ان تمام معاملات کو عبادات کے زمرہ میں شامل نہیں کیا جاسکتا پھر اس کاروبار حیات کو جاری رکھنے کا حکم بھی اسلام نے ہی دیا ہے کیونکہ اسے ترک کرکے ہمہ وقت عبادت اور ذکروفکر میں مشغول رہنا ''رہبانیت'' ہے جسے نظام حیات کے طور پر دکھانے کی اجازت اسلام نہیں دیتا اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی عبادت ہے جس کو انسانی تخلیق اور اس کی حیات کا مقصد اور نصب العین قرار دیا گیا ہے جو جملہ عبادات اور معاملات حیات میں یکساں طور پر انسان کے پیش نظر رہ سکے یہاں یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ اصل نصب العین اور مقصد وہ ہوتا ہے جو کسی حالت میں نظر انداز نہ ہونے پائے۔

کھولی ہیں شوق دید نے آنکھیں تیری اگر
ہر رہگذر میں نقش کف پائے یار دیکھ

جو لمحہ مقصد حیات سے بے توجہی اور بے التفاتی میں بسر ہو وہ گناہ ہوتا ہے اور بارگاہ ربوبیت میں ناپسندیدہ یعنی ''جودم غافل سودم غافل کافر''

خود کو اتنا محو کر لیتا ہوں تیری یاد میں
تو ہی تو ہوتا ہے کوئی دوسرا ہوتا نہیں

اگر عبادت سے مراد یہی تصور لیا جائے جو عام مذہبی ذہن میں راسخ ہے تو اس طرح انسانی زندگی کے جائز اور شروع معاملات بھی تضاد کا شکار ہو جائیں گے کیونکہ بعض معاملات انسانی نصب العین کے مطابق ہونگے اور بعض اس کے خلاف۔

اس الجھاؤ اور شبہ کو رفع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عبادت اور بندگی کا وہ جامع اور وسیع

تصور ذہین نشین کرلیا جائے جو انسانی زندگی کے جملہ معاملات پر حاوی ہے اور جس کا تعارف خود قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کر دیا ہے:

ترجمہ:۔ نیکی یعنی اصل عبادت یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو بلکہ نیکی تو یہ ہے کہ انسان ایمان لائے اللہ، قیامت، فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر اور پھر اللہ کی محبت میں اپنے ایمان کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے اپنا سرمایہ و دولت خرچ کرے مستحق رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں دیگر سائلوں پر اور لوگوں کو طوق غلامی سے آزاد کرانے پر اور نماز قائم کرے زکوٰۃ دے جب وعدہ کرے تو اپنے قول کو پورا کرنے والا ہو اور صبر کرنے والا ہو مصائب و آلام میں مشکلات میں اور جنگ و جدل کے وقت میں یہی سچے لوگ ہیں اور یہی پرہیز گار"

عوام کے ذہنوں میں عام طور پر محدود تصور واضح ہوتا ہے اور وہ نماز کو عبادت، نیکی اور بندگی کہتے ہیں زندگی کے باقی معاملات دنیاوی تصور کئے جاتے ہیں قرآن کی رو سے اگر کوئی شخص مشرق یا مغرب کی جانب قبلہ رو ہو کر نماز و غیرہ پڑھنے کو ہی نیکی اور اصل عبادت سمجھتا ہے تو یہ غلط ہے اسلام کے نزدیک عبادت اور نیکی کا مفہوم اس قدر محدود نہیں کہ جس عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو بلکہ قرآنی تصور عبادت اور اسلامی مفہوم اس قدر وسیع ہے جو انسان کی فکری اور عملی زندگی کے عام گوشوں پر محیط ہے۔

کامل عبادت اور بندگی یہ ہے کہ انسان پوری زندگی اس طرح بسر کرے جیسے اس کے خالق کی رضا ہو وہ ایک ہی راستہ ہے جو نبی مکرمؐ نے اختیار کیا اس کے علاوہ کسی دوسرے رستہ کی اللہ تعالیٰ تک رسائی نہ ہے۔

انفرادی سطح پر انسان کا مقصد حیات انسان مرتضےٰ یعنی ایسا انسان بننا ہے جس پر اس کا رب راضی ہو یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ کسی کی محبت میں ایثار و قربانی، صبر آزما جد و جہد اور مصائب کا خوشی سے برداشت کرنا محض محبوب کی رضا کی خاطر ہوتا ہے اگر محبوب کو راضی کرنا پیش نظر نہ ہو تو کوئی کیونکر تکالیف کو دعوت دے گا۔ اور اپنی جان مال کی قربانی پر آمادہ ہوگا۔ جو لوگ رضا الٰہی کو اپنا مقصد اور نصب العین تصور کرتے ہیں اور اس کے حصول کی خاطر دنیاوی منافع سے خود کو محروم کر لینا بھی گوارہ کر لیتے ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ سچائی کی راہ پر گامزن قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی یہ مژدہ جاں فزا سناتے ہیں۔ "تم لوگ حقیت میں خدا اور اس کے رسول کے مددگار ہو" اہل حق کی

پوری زندگی رضا الٰہی کی خاطر متحرک رہتی ہے۔ چنانچہ ان کی دشمنیاں اور دوستیاں سب اللہ کی رضا کی خاطر ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں " محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کی صحبت اور معیت سے فیض یاب ہوئے وہ کافروں پر نہایت سخت ہیں آپس میں رحمت اور مودت سے پیش آتے ہیں آپ ان کو رکوع و سجود کی حالت میں دیکھیں گے اور ہر حال میں اللہ کا فضل اور اس کی رضا تلاش کرتے رہتے ہیں" غلامان مصطفیٰ کے بارے میں علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اس کا عملی مظاہرہ حال ہی میں عراقی مسلمانوں نے کیا ہے جن پر امریکی بھیڑیئے اور اس کے اتحادی باولے کتوں نے ظلم ڈھانے کے لئے ہر قسم کا جدید ترین اور مہلک ترین اسلحہ آزمایا معصوم بچوں کو شہید کیا عورتوں کو بیوہ کیا تمام عراقی روشنیاں بکھیرتے شہروں کو کھنڈرات میں بدل دیا لیکن پھر بھی وہ مسلمان ثابت قدم رہے ان کی عظمت کو سلام کرتے ہیں۔

اگر چند غدار اپنی قیمت نہ لگواتے تو امریکی اور اتحادی افواج کا عراق میں قبرستان بنا دیا جاتا۔ دراصل امت مسلماں میں سے اسلام کی روح نکال دی گئی ہے اس کا مظاہرہ آپ خود دیکھ رہے ہیں ظالم کافروں نے مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھائے مگر (57) مسلمان ریاستیں انسانوں کی بے بسی کا تماشہ دیکھتی رہی یا پھر زبانی کلامی نعرہ بازی کرتی رہیں اور اس بے حسی کا معاوضہ ڈالروں کی شکل میں وصول کرتی رہیں۔

یاد رکھو بھیڑیا بھڑوں کی میں میں سے متاثر نہیں ہوتا وہ صرف شیر کے آہنی پنجہ سے مرعوب ہوتا ہے۔

جہاں مردان حر بستے ہیں ایک ہیبت سی ہوتی ہے
نہیں باطل کو ہوتا خوف ہرگز نازنینوں کا

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ بحیثیت قوم ہمیں اسلام کی روح عطا فرمائیں۔ غیرت سے جینا اور عزت سے مرنا نصیب فرمائیں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایک دوسرے کے دکھ درد میں عملی طور پر شریک ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ قرآن کو اور نبیؐ کے فرمان کو ہمارا رہنما بنا دے (آمین)

دس دن مدینہ منورہ میں

(امین احسن اصلاحی)

ان قلبی احساسات کی قلمی تصویر جو حرم نبویؐ میں فطری سادگی اور بے ساختگی سے وارد ہوئے سورج نکلا تو ساتھ ہی مدینہ الرسولؐ کے آثار طلوع ہوئے۔ دور سے احد کی چوٹیاں نظر آئیں، یہ وہ پہاڑ ہے جس سے ہمارے نبیؐ محبت کرتے تھے۔ میں نے دیکھتے ہی کہا "اے احد! ہم بھی تجھ سے محبت کرتے ہیں"۔ اس وقت سے بس یہی دعا دل اور زبان دونوں پر جاری رہی کہ اگر پروردگار کریم وکارساز نے یہاں آنا نصیب کیا ہے تو یہاں سے محروم نہ لوٹائے۔

شہر میں داخل ہوئے تو ایک ساتھی نے توجہ دلائی کہ افق میں مسجد نبویؐ کا مینار نظر آتا ہے۔ درودوسلام پڑھتے ہوئے میری نگاہوں نے اس سے معانقہ کیا۔ اس کے بعد سے یہ مینار ہر شخص کا مرکز نگاہ بن گیا۔ سڑک کے پیچ وخم میں اگر یہ نگاہوں سے ذرا او جھل ہوتا تو دل بے قرار ہو جاتا۔

روضہ اقدس پر حاضری

مکان ملتے ہی ہم نے سامان اس میں منتقل کرایا اور نہا دھو کر مسجد نبویؐ اور روضہ اقدس کی حاضری کے لئے تیار ہو گئے۔ ظہر کا وقت قریب تھا۔ لہٰذا جب مسجد نبویؐ میں داخل ہوئے تو مسجد کا اگلا حصہ نمازیوں سے بھر چکا تھا۔ بڑی مشکلوں سے ہم روضہ اقدس تک پہنچ سکے۔ نفل پڑھنے کے لئے بھی بہ ہزار دقت جگہ ملی۔ روضہ اقدس کی جالیوں کے سامنے بھی بڑا اہجوم تھا۔ لوگ بلند آواز سے سلام پڑھ رہے تھے جس سے خاصا شور تھا۔ حکیم صاحب (حکیم عبدالرحیم اشرف) تو صاحب عزیمت ہیں، وہ کہیں بھی افضلیت قربان کرنے پر تیار نہیں ہوتے اور اللہ تعالیٰ طلب کے مطابق انہیں راہ بھی دیتا تھا لیکن میں نے اپنے لئے اسی کو غنیمت جانا کہ اس بزم قدسؐ میں باریابی تو ہو گئی، اس سے کیا بحث کہ کہاں جگہ ملی۔

مجھے جب اندازہ ہو گیا کہ اب میں حضورؐ کے مواجہہ میں حاضر ہو چکا ہوں تو میری نگاہیں خود بخود ادب سے جھک گئیں اور میں نے سلام پڑھا۔ لیکن سلام پڑھتے ہوئے بار بار میری زبان پر درود شریف کے الفاظ جاری ہو جاتے۔ ممکن ہے یہ عادت کا غلبہ ہو یا اس کا سبب یہ ہو کہ میں نے مدینہ شریف کے لئے روانہ ہونے کے وقت ہی دوسری دعاؤں میں تخفیف کر کے درود شریف کی تکثیر کر دی تھی۔ میں نے اپنا حال دوسروں سے کچھ مختلف پایا۔ پہلے وہلہ میں تو میری پلکیں ذرا سی

بھیگ گئیں جیسے کسی نہایت ہی غیر معمولی خوشی کے جوش و جذبہ سے مغلوب ہو کر ایک گریہ مسرت کی حالت طاری ہو گئی ہو۔ پھر جب تک مواجہہ شریف میں حاضر رہا، رعب اور دہشت کی جگہ ایک عمیق اعتماد کی حالت طاری رہی بلکہ اگر میں اس حالت کو تذلل کے لفظ سے تعبیر کروں تو شاید یہ لفظ میری اس وقت کی حالت کو بہتر طریقے سے تعبیر کر سکے۔

اس کے بعد حضرات شیخینؓ کی قبروں کے سامنے ذرا ذرا دیر کے لئے رکنے کا موقع نصیب ہوا۔ جب میری زبان سے صدیق اکبرؓ کی قبر پر دعا کے یہ الفاظ نکلے کہ اے رب تو ان کو ان کی ان عظیم خدمات کا صلہ دے جو انہوں نے اسلام کی تبلیغ کے لئے انجام دی ہیں، تو میرا دل امنڈ آیا اور میں اپنے آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکا۔ فاروق اعظمؓ کی قبر کے سامنے جب میں کھڑا ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جوش عقیدت و محبت کی گرمی سے میرا دل پگھل کر بہہ جائے گا۔ میں نے ان کی قبر پر خاص طور پر یہ دعا بار بار کی "اے رب ذوالجلال تو نبی خاتمؐ کی امت اور اسلام کی سر بلندی کے لئے ان کی روح کو ہمارے اندر پھر بیدار کر دے!"

جب نماز ظہر کی اذان ہوئی تو جہاں جگہ ملی ہم نماز کی صفوں میں جا شامل ہوئے۔ یہ اس مسجد میں ہماری پہلی نماز تھی جس کے چپے چپے پر ہمارے رسولؐ اور ان کے صحابہؓ کے سجدوں کے نشانات ثبت ہیں۔

مسجد نبویؐ میں حاضری

میں نے دیکھا کہ مسجد نبویؐ میں آٹھ نو کے درمیان اور پھر عصر و مغرب کے درمیان ازدحام کسی قدر کم ہوتا ہے۔ چنانچہ معروف اوقات کے علاوہ یہ دونوں وقت بھی میں نے مسجد نبویؐ کے لئے خاص کر لیے۔ عشاء اور مغرب کے درمیان کا وقت بھی عموماً وہیں گزارتا۔ کنکریوں والے پلاٹوں میں کسی پلاٹ میں جا بیٹھتا اور عشاء کی نماز تک وہیں بیٹھا رہتا۔

درود شریف کا ورد

روضہ اقدسؐ پر صبح و شام مناسب اوقات میں سلام کے لئے حاضر ہوتا اور وہی سلام پڑھتا جو عام طور پر ثقہ لوگوں سے منقول ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ مجھے کچھ انشراح حاصل نہیں ہو رہا۔ دل کے اس انقباض کو میں نے اپنی طبیعت کی کثافت اور نااہلیت پر محمول کیا۔ بالآخر ایک روز ادب کے ساتھ سلام کرتا ہوا مواجہہ شریف کے بجائے حضورؐ کے پائنتیں کی طرف جا کر کھڑا

ہوگیا۔ وہاں میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی "اے رب تو میرے دل کو نفاق کی ہر آلائش سے پاک کر اگر یہاں سے میں محروم لوٹا تو پھر کس در سے پانے کی امید کر سکتا ہوں؟ اس کے بعد عادت کے غلبے کی وجہ سے میری زبان پر درود شریف جاری ہوگیا اور میں بڑی دیر تک پڑھتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس سے میرا دل کچھ کھل سا گیا۔ میں نے پھر معمول بنالیا کہ جالیوں کے سامنے حاضر ہو کر مختصر سلام عرض کرتا پھر پائنتیں کی طرف جا کر کھڑا ہو جاتا اور درود شریف پڑھتا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید میری طبیعت کو اسی چیز سے زیادہ مناسبت ہے اور اس دربار میں اس گناہ گار امتی کی جگہ یہی ہے۔

جنت البقیع میں

اس دوران جنت البقیع میں بھی حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہاں عورتوں کو جانے کی سعودی حکومت نے ممانعت کر رکھی ہے اس وجہ سے میری اہلیہ نہ جا سکیں۔ اپنی اس محرومی کا ان کو بڑا صدمہ ہوا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا عورتوں کا قبروں پر جانا شریعت میں ممنوع ہے؟ میں نے کہا کہ ممنوع تو نہیں ہے لیکن یہ نجدی حضرات اس معاملے میں بڑے متشدد واقع ہوئے ہیں، اس وجہ سے صبر کرو اور باہر ہی سے فاتحہ پڑھ لو۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ سارے دوران قیام مدینہ میں اپنی اس محرومی پر بہت دل گرفتہ رہیں۔ انہیں ازواج مطہراتؓ بنات طاہراتؓ اور صحابہؓ و صحابیاتؓ کی قبروں پر حاضر ہونے کا بے انتہا شوق تھا اور جب وہ پورا نہیں ہوا تو انہیں بڑا شاق گزرا۔ آخر ان بزرگوں کی برکات میں ان خواتین کا بھی تو برابر کا حصہ ہے، پھر انہیں ان کے حصے سے محروم کرنے کی کوشش کیوں کی جائے؟

جنت البقیع کی حالت دیکھ کر بہت صدمہ ہوا۔ مجھے یہ علم تھا کہ نجدی فوجوں نے اپنے غلبے کے ابتدائی دور میں تمام قبریں زمین کے برابر کر دی تھیں لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ سرے سے قبروں کے نشانات ہی مٹا ڈالے گئے ہیں، سارا قبرستان بس ایک تودہ خاک کی شکل میں نظر آتا ہے۔ بہت کم قبریں ایسی ہیں جن کے کچھ نشانات موجود ہیں۔

میں قبروں کے معاملے میں ہرگز کوئی بدعت پرستانہ رجحان نہیں رکھتا اور انہیں بالکل فضول سمجھتا ہوں جو کسی قبر پر کسی غیر شرعی مقصد کے لئے جاتے ہیں۔ کسی قبر پر سجدہ کرنا یا سر جھکانا یا اس کو بوسہ دینا صرف اپنے رب ہی کی نہیں بلکہ اس شرف انسانی کی بھی توہین سمجھتا ہوں جس کا شعور

میرے رب نے خود میرے اندر ودیعت فرمایا لیکن اس سب کے باوجود میں قبروں کی افادیت بالخصوص اسلام کے اعاظم رجال کی قبروں کی افادیت سے انکار نہیں کرسکتا۔

میں اپنا ذاتی تجربہ عرض کرتا ہوں کہ جس وقت میں سیدنا عثمان غنیؓ کی قبر پر حاضر ہوا، تو مجھے یہ خیال آیا کہ یہ اس عظیم انسان کی قبر ہے جس نے طاقت اور اقتدار رکھتے ہوئے بھی مظلومانہ شہادت کو ترجیح دی لیکن یہ پسند نہ فرمایا کہ اس کی ذات امت محمدؐ میں کسی خونریزی کا سبب بنے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس امت کی محبت اور خیر خواہی کا حقیقی مفہوم آج زندگی میں پہلی بار میرے سامنے آیا ہے۔ میرے نزدیک ان کی قبر اس دنیا میں ان کے اس کردار کا واحد نشان ہے اور ایک جاننے والے شخص کے لئے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی حال ان تمام صحابہؓ اور صحابیاتؓ کی قبروں کا ہے جن کے کردار سے ہمارے کردار بنتے اور سنورتے ہیں۔ ہمیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے نہ کہ انہیں بے نشان کرنا چاہیے۔

میں نے دیکھا کہ بدعات اور اوہام کے مرض اس قبرستان میں نگرانوں کی آنکھیں بچا کے عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ مثلاً بہت سے حضرات کو میں نے دیکھا کہ وہ جلدی جلدی زمین پر قبروں کی سی لکیریں کھینچ رہے ہیں۔ میں نے ان کی اس حرکت کا جب فلسفہ معلوم کرنا چاہا تو بعض دوستوں نے بتایا کہ یہ لوگ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی قبروں کے نشانات بنا رہے ہیں، ان کا تصور یہ ہے کہ جن جن کی قبروں کے نشانات اس مقدس قبرستان میں بن جائیں گے، قیامت کے دن وہ سارے لوگ اسی قبرستان سے اٹھیں گے۔ ایک یمنی بزرگ نے لوگوں کو یہ حرکت کرتے دیکھا تو ایک طنز آمیز ہنسی کے ساتھ فرمایا" **لن یصیبنا الا ما کتب الله لنا** " اگر وہ اردو میں پنا مدعا کہتے تو یہ شعر پڑھتے۔

یہ رتبہ ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دارو رسن کہاں

ایک دلچسپ واقعہ

ایک روز ہم مسجد نبویؐ میں مغرب کے بعد بیٹھے تھے کہ بجلی دفعتاً گل ہوگئی۔ اچانک مسجد کا تقریباً آدھا حصہ جو خواتین کے لئے مخصوص ہے، تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی مقرر کے کسی پرزور فقرے پر حاضرین کی طرف سے داد دی جا رہی ہو۔ مجھے اس واقعہ پر

سخت حیرانی ہوئی۔ مسجد نبویؐ کے اندر یہ تالی پیٹنے کی جسارت کون لوگ کر سکتے ہیں؟ ہمارے زمانہ قیام میں بیشتر زائرین مصر اور شام سے تعلق رکھنے والے تھے۔ قدرتی طور پر خواتین میں بھی اکثریت مصر اور شام ہی کی خواتین کی تھی۔ میں ان خواتین کی آزادروی کا تو قائل ہوں لیکن یہ گمان نہیں تھا کہ مسجد نبویؐ کے احترام کو بھی بالائے طاق رکھ دیں گے۔

جب مسجد سے باہر نکلا تو میں نے بعض لوگوں سے اس واقعے کا ذکر کیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جب کبھی بجلی گل ہو جاتی ہے تو مصر اور شام کی خواتین اسی طرح تالی بجا کر اسے بلاتی ہیں۔ یہ بات کچھ میرے دل کو نہیں لگی، میں حیران ہوا کہ اس طرح کے کسی واہمے پر اس درجے کا ادعا ان لوگوں کو کس طرح ہو سکتا ہے کہ ادب واحترام کی اس سب سے بڑی جگہ میں بھی وہ طبائع پر غالب آ جائے۔ بالآخر ایک روز میرا یہ شک دور ہوا۔ عرفات سے مزدلفہ واپس ہوتے ہوئے ایک مرتبہ ہماری بس کی روشنی گل ہو گئی۔ میرے قریب ایک مصری بچی بیٹھی ہوئی تھی۔ روشنی کا گل ہونا تھا کہ وہ فوراً تالی پیٹ پیٹ کر روشنی کو بلانے لگی۔ بلانے کا یہ انداز بڑا معصومانہ تھا۔ تین مرتبہ تالی بجاتی اور پھر اپنے داہنے ہاتھ کو اوپر کی طرف لے جا کر اس طرح نیچے کی طرف لاتی گویا روشنی کو راہ نمائی دے رہی ہے کہ یوں آ جا۔ اس معصوم بچی کی اس معصومانہ ادا نے میری ایک بڑی الجھن دور کر دی۔ خدا ڈرائیور کا بھی بھلا کرے کہ اس نے اسی اثنا میں سوئچ دوبارہ چلا دیا اور بچی خوش ہو گئی کہ اس کا جادو کامیاب رہا۔

روانگی کے وقت کا خاص تاثر

دس دن کی مدت ہی کیا ہوتی ہے، دل کا کوئی ارمان بھی ابھی پورا نہیں ہو پایا تھا کہ واپسی کی تاریخ آ گئی۔ اس دوران ایک خلش نے دل کو برابر پریشان رکھا؟ وہ یہ کہ میں نے بہتوں کو دیکھا کہ ان کی دلی حالت میرے دل کی حالت سے کہیں بہتر ہے۔ وہ روضہ اقدس پر حاضر ہوں تو ان کی آنکھیں شہادت دیتی ہیں کہ ان کے سینوں میں نبیؐ کی محبت کی گرمی موجود ہے۔ میں اپنا حال یہ نہیں پاتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ خدانخواستہ میں حضورؐ کی محبت اپنے دل میں محسوس نہیں کرتا تھا، محسوس تو بہت کچھ کرتا تھا، کبھی کبھی تو ایسی کیفیت ہوتی کہ جی چاہتا کہ روضہ اقدس کے سامنے دل نچوڑ کر رکھ دوں۔ لیکن آنکھوں کی راہیں کچھ بند بندسی محسوس کرتا تھا۔

دس دن اسی ذہنی اور قلبی الجھن میں گزر گئے مجھے اندر ہی اندر یہ غم کھائے گیا کہ اس حالت کی

وجہ دل کی سختی ہے۔ روانگی کے دن میرا یہ احساس بہت شدید ہوگیا۔ میں جب وداعی سلام کے لئے حاضر ہوا تو اپنے اس احساس کے سبب اتنا دل شکستہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا میری زندگی اب ہر ارمان اور حوصلے سے خالی ہوگئی ہے۔ میں جب مسجد نبویؐ میں حاضر ہوا تو ازدحام نہیں تھا۔ میں نے روضہ جنت میں نفل پڑھے اور سجدے میں دعا کی "اے رب! میں تیرا گناہ گار بندہ اور تیرے نبی کا گناہ گار امتی ہوں۔ اگر تو نے مجھ پر یہ فضل فرمایا کہ میں تیرے ان مقدس اور پاک گھروں میں حاضری دے سکا تو مجھے یہاں سے محروم نہ واپس کر۔ میں اس زندگی میں یہ سعادت پھر حاصل کر سکوں گا یا نہیں اس کو تو ہی جانتا ہے اور یہ چیز تیرے ہی اختیار میں ہے اپنے غلام پر رحم کر اور میرے دل کی حالت بدل دے۔ اگر میں تیرے اس دروازے سے بھی محروم لوٹا تو وہ کون سا دروازہ ہے جہاں میں کوئی امید لے کر جا سکتا ہوں"۔

اس دعا کے بعد آخری سلام کے لئے حاضر ہوا اور مواجہہ شریف پہنچا وہاں سلام کا پہلا کلمہ زبان سے ادا ہی ہوا تھا کہ دفعتاً محسوس ہوا کہ دل کے اندر ایک بند تھا جو ٹوٹ پڑا ہے اور آنکھوں سے ایک طوفان ہے جو ابل پڑا ہے۔ میں زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا اور دیوار کا سہارا لے کر دوزانو بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب رخصت ہونا چاہا تو دل اس سلام کو آخری سلام ماننے کے تیار نہ ہوا۔ چند قدم دروازے کی طرف بڑھتا تو دل مجبور کرتا کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ کو اور سلام کر آؤں کہ یہ سعادت پھر اس زندگی میں حاصل ہو یا نہ ہو! بڑی دیر کے بعد جب اس کشمکش سے چھوٹا تو مسجد نبویؐ کے دروازے سے نکلتے ہوئے پھر اسی طرح کی کشمکش سے دوچار ہوا۔ جب قدم باہر نکالوں اور یہ خیال آئے کہ معلوم نہیں اب اس گھر میں پھر داخل ہونا نصیب ہو یا نہ ہو، تو دل بیٹھنے لگتا۔ مگر اس زندگی میں ہمیشہ دل ہی کی نہیں چلتی، آخر مجبور ہو کر مسجد نبویؐ اور روضہ اقدس سے جدا ہونا ہی پڑا۔

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆

اعلیٰ اخلاقی قدریں دل کے اندر کھوئی ہیں ان کی باہر تلاش ہے

(مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

ایک کہانی

دوستو! بچپن میں ایک کہانی سنی تھی۔ ایک صاحب سڑک پر کچھ تلاش کر رہے تھے لوگوں نے پوچھا صاحب آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟ انھوں نے کہا جیب سے اشرفی گر گئی تھی، اسے تلاش کر رہا ہوں کچھ بھلے مانس بھی ان کے ساتھ تلاش میں لگ گئے، تھوڑی دیر کے بعد کسی نے پوچھا، حضرت وہ اشرفی کہاں گری تھی؟ کہنے لگے گری تو گھر کے اندر تھی مگر مشکل یہ ہے کہ گھر میں روشنی نہیں ہے، سڑک پر روشنی ہے اس لئے یہاں تلاش کر رہا ہوں۔

انسان کی سہولت پسندی

بظاہر تو یہ ایک افسانہ یا لطیفہ معلوم ہوتا ہے مگر واقعات کی دنیا میں دیکھیں گے تو یہی نظر آئے گا کہ جو چیز گھر میں کھوئی ہے، اس کی آج باہر تلاش ہے، بڑے بڑے میدانوں میں آج یہی ہو رہا ہے کہ گھر کی چیز باہر تلاش کی جا رہی ہے کوئی چیز کھوئی تو گئی ہے اپنے اندر مگر تلاش اس کی باہر ہے، کیونکہ باہر روشنی ہے، آج بہت سی ایسی چیزوں کی کمیٹیوں اور جلسوں میں تلاش ہے۔ سکون، امن، اطمینان اندر کی چیزیں ہیں لیکن ان کی تلاش باہر ہے انسانیت کی قسمت اندر سے بگڑی ہے لیکن باہر اس کو بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جس امن وسکون اور اطمینان قلب کی ہمیں ضرورت ہے، جس محبت کی فضا، ہمدردی کی فضا، اخلاق کی فضا کی ہمیں اور آپ کو ضرورت ہے، زندگی کا جو جوہر اور زندگی کا جو قیمتی سرمایہ آج مفقود ہے وہ سب دل کی دنیا میں کھویا ہے، لیکن وہاں اندھیرا ہے، وہاں ہماری گزر نہیں، اس لئے ہم اس کو باہر ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہم نے بڑا ظلم کیا کہ پہلے ہم نے دلوں میں جانے کا راستہ کھویا، اب اس کی چیزوں کو باہر تلاش کر رہے ہیں، آج دنیا کے اسٹیج پر یہی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے دل کی دنیا میں اندھیرا ہے وہاں برسوں سے گھٹا ٹوپ اندھیاری ہے، ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا، انسانی فطرت سہولت پسند ہے اس نے کبھی یہ زحمت برداشت نہیں کی کہ دل کے اندر ڈوب کر کھوئی ہوئی قیمتی چیز کو تلاش کر لے، اس نے اس کو آسان سمجھا کہ باہر روشنی میں اپنے گم شدہ مال کو تلاش کرے، آج قومیں حیران ہیں، بڑے بڑے حکیم و

دانا سرگرداں ہیں، لیکن اس کا سرا نہیں ملتا کہ ہمارا مال کھویا کہاں ہے لوگوں نے جب دیکھا کہ دل کا دروازہ نہیں ملتا اور اس پر بس نہیں چلتا، اس کو روشن اور گرم کرنے کا سامان ہمارے پاس نہیں تو انھوں نے دماغ کی طرف توجہ کی اور انسانوں کے معلومات بڑھانا شروع کر دیئے جو بات آسان تھی وہ کرنے لگے۔ دماغ تک پہنچنا آسان تھا، انھوں نے دل کو چھوڑ کر دماغ کا راستہ اختیار کر لیا۔

آج ہر ایک اسی قافلہ کا شریک ہے جو آرہا ہے وہیں جا رہا ہے، دل کے اندر پہنچنے کی کوشش نہیں، دنیا کی چول جب تک اپنی جگہ پر نہ آئے سدھار ناممکن ہے، گھر میں اندھیرا ہے تو روشنی باہر سے لانا پڑے گی اور گھر میں کھوئی ہوئی پونجی اور من کی لٹی دولت کو وہیں تلاش کرنا پڑے گا، اگر ایسا نہ کیا تو زندگی ختم ہو جائے گی اور اس کا سراغ نہیں ملے گا۔

حقیقتوں سے کشتی نہیں لڑی جاسکتی

آج ضرورت تھی کہ ان حقیقتوں کو ابھارا جاتا، انسانوں کو زندگی کا مقصد بتایا جاتا، تعلقات درست ہوتے، انسان حیوانی سطح سے بلند ہوتے، ایک دوسرے سے محبت ہوتی، ایک دوسرے کے لئے قربانی کا جذبہ ہوتا، ایک دوسرے کو بھائی کی نظر سے دیکھا جاتا، رقابت کی نظریں بند ہوتیں، اعتماد اور محبت کی نظریں پیدا ہوتیں، حقیقتیں گم ہو گئیں، سب سے بڑی حقیقت حقیقتوں کی جان یہ تھی کہ کس نے اس دنیا کے کارخانے کو بنایا ہے، وہ اسی کی مرضی اور ہدایت کے مطابق ٹھیک ٹھیک چل سکتا ہے، اگر اس سے لڑنے کی کوشش کی جائے گی اور اس کی ہدایات (Directions) کے مطابق کام نہیں ہوگا، تو کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا، گھڑی کی مثال لے لیجئے جو اس کا ماہر خصوصی (Specialist) ہے، اس کی ساخت سے واقف ہے وہی اس کی کل درست کر سکتا ہے، کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم و فاضل ذہین اور فلسفی ہو، لیکن گھڑی اس کی ذہانت اور علم سے درست نہیں ہو سکتی، وہ تو ماہر فن کے چلانے سے چلے گی، یہ دنیا جس نے بنائی ہے اسی کی ہدایت سے ٹھیک ٹھیک چلے گی، حقیقتوں سے کشتی نہیں لڑی جاسکتی ان کے سامنے سر جھکانا ہی پڑے گا۔

انسان دنیا کا ٹرسٹی ہے

میں اس وقت آپ سے کچھ بے لاگ باتیں کرنا چاہتا ہوں، لعنت ہے ایسی زندگی پر جس

میں کبھی سچی بات نہ کہی جاسکے، آج ہر آدمی فائدہ دیکھتا ہے اور فائدے کے پیش نظر سچ یا جھوٹ بولنے میں ذرا پس وپیش نہیں کرتا، دنیا میں ایسے آدمیوں سے سدھارنا ممکن ہے، جو دو چار ایسے آدمی دنیا میں موجود ہیں انہیں سے دنیا قائم ہے جو ہمیشہ سچی بات کہتے ہیں چاہے جان جائے۔ آج دنیا کے رخ پر جونکھار اور تابانی ہے یہ ان حق گو پیغمبروں، اللہ کے بھیجے ہوئے انسانوں کے خون جگر کا نتیجہ ہے جنہوں نے انسانیت کی فلاح اور قیام کے لئے اپنی زندگیاں نثار کردیں۔ اور اس طرح سے اس مقدس ورثہ اور گراں قدر متاع کے ہم وارث ہوئے۔ انسانیت کی نجات کا راستہ وہی درخشاں راستہ ہے جسے ان لوگوں نے دکھایا، آج بھی جب تک ہم یہ نہ سمجھیں کہ دنیا ہمارے لئے ہے اور ہم خدا کے لئے ہیں، ہم اس کے متولی (Trustee) اور امین ہیں اور خدا کے سامنے ذمہ دار اور جوابدہ ہیں، انسانیت کی مشکلیں حل نہیں ہوسکتیں، یہ تھا راستہ مشکل اور کانٹوں بھرا، لیکن یہی انسانیت کا راستہ تھا، یہ ایک ذمہ داری کی بات تھی، لوگوں نے اس سے گریز کیا، اور کلچر اور تہذیب کا نام لینا شروع کردیا۔

انسانیت کا مسئلہ پرانی تہذیبوں سے حل نہیں ہوسکتا

دنیا کی تمام تہذیبیں قابل احترام ہیں، خصوصاً اپنے ملک ہندوستان کی تہذیب ہمیں عزیز ہے، یہ ہماری میراث ہے اور ہم اس کی قدر کرتے ہیں لیکن انسانیت کا صحیح ارتقاء پرانی تہذیبوں سے نہیں ہوسکتا، ان چیزوں میں اب جان نہیں رہی ان کی صلاحیت اب ختم ہوگئی۔ یہ اپنا مشن (Mission) پورا کرچکیں یہ اپنا پارٹ ادا کرچکیں ان کے بہت سے پہلو اب بھی بہت اچھے ہیں لیکن آج انسانیت کے عروج کے لئے اور عام اخلاقی گراوٹ کو روکنے کے لئے ان میں کوئی جان نہیں، ان کے پاس کوئی پیغام نہیں، جس طرح ایک جگہ کی چیز دوسری جگہ نصب (Adjust) نہیں کی جاسکتی دو ہزار برس کی چیز آج کے ماحول میں کام نہیں دے سکتی، عربوں کی پرانی تہذیب رومیوں اور یونانیوں کی تہذیب اپنے اپنے وقت کی زندہ اور ترقی یافتہ تہذیبیں تھے، لیکن اب وہ اپنا نمو اور شادابی کھوچکیں، اب ان کی جگہ صرف آثار قدیمہ میں ہے۔

تہذیبیں انسانیت کا لباس ہیں انسانیت لباس تبدیل کرتی رہتی ہے

انسانیت تہذیبوں سے بالاتر ہے، یہ سب تہذیبیں مل کر بھی آدمیت کو جنم نہیں دیتیں، آدمیت تہذیبوں کو جنم دیتی ہے، آدمیت کسی مخصوص زمانے اور کسی مخصوص مقام سے مخصوص نہیں،

تہذیبیں اس کا لباس ہیں اور وہ اپنا لباس بدلتی رہتی ہے اور اپنے سن اور اپنے ذوق کے مطابق اپنے کو آراستہ کرتی رہتی ہے اور یہ بالکل قدرتی اور ضروری ہے، جو بچہ ہے وہ بچوں کا لباس پہنے گا، جو جوان ہے وہ جوانوں کا چولا بدلے گا، بچوں کا لباس جوان کو نہیں پہنایا جا سکتا، انسانیت کو کسی خاص دور یا کسی خاص ملک کے کلچر کا پابند نہ کیجئے۔ انسانیت کو بڑھنے دیجئے انسانیت آب حیات کا چشمہ ہے اسے ابلنے دیجئے۔ یہ صحرا، ریگستان اور میدانوں میں دوڑنا چاہتا ہے اسے بڑھنے اور پھیلنے دیجئے۔ مذہب کے عالمگیر اور زندہ اصولوں اور اپنی ذہانت اور ذوق سے انسانیت کا ایک نمونہ اور ایک نیا پیکر پیدا کیجئے انسانیت کا اخلاق کا ایک نیا گلدستہ بنائیے، وہ تازہ اور شاداب گلدستہ ہوگا، جو پھول سوکھ گئے، مرجھا گئے، ان کو گلے کا ہار بنانے پر اصرار نہ کیجئے۔

مذہب روح دیتا ہے، کلچر ایک ڈھانچہ

مذہب اور تہذیب کا راستہ الگ ہے، مذہب روح دیتا ہے اور کلچر ایک ڈھانچہ (Modle) مذہب طریقہ حیات اور زندگی کا ایک ضابطہ دیتا ہے کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے، پھر آزاد چھوڑ دیتا ہے، مثال کے طور پر تہذیب کہتی ہے کہ سیٹھے کا قلم مقدس ہے اور مذہب کو اس سے بحث نہیں کہ لوہے کے قلم سے لکھا جائے یا فونٹن پن سے، اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ سچ ہو اور اچھا، مذہب مقصد حیات عطا کرتا ہے اور زندگی کو روح دیتا ہے وہ انسانی زندگی پر کنٹرول قائم رکھتا ہے مگر اس سے حرکت اور نشوونما کی صلاحیت نہیں چھینتا کلچر کا احیاء انسان کی نجات نہیں، چاہے یہ کام ہندو کرے یا مسلمان یا عیسائی۔

رسم الخط یا ضمیر و اخلاق

آج اس پر بڑا معرکہ برپا ہے کہ ملک کی زبان کیا ہونی چاہیے، کس رسم الخط میں لکھنا چاہیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کے درد کا مداوا اسی میں ہے ملک کا سدھار اسی پر موقوف ہے۔ دوستو! پیغمبروں کے سوچنے کا طریقہ یہ نہیں۔ ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تحریر کہاں سے شروع کی جائے اور کہاں ختم کی جائے، دائیں سے شروع ہو کر بائیں طرف یا بائیں سے شروع ہو کر دائیں طرف، ان کو تو اس سے دلچسپی ہے کہ لکھنے والا سچا، خدا سے ڈرنے والا، امانتدار اور فرض شناس ہو۔ پھر وہ کسی طرح لکھے وہ اچھا ہوگا۔ میں نے بنارس میں کہا تھا کہ اگر دستاویز جھوٹی ہے تو کیا دائیں سے شروع کرنے اور اردو یا فارسی میں لکھنے سے یا بائیں سے شروع کرنے اور ہندی یا

انگریزی میں لکھنے سے وہ سچی ہو جائے گی؟ جھوٹی اور جعلی دستاویز کو جس طرح اور جس طرف سے لکھو گے وہ جھوٹی اور جعلی اور پاپی رہے گی، سچی دستاویز کو جس طرح اور جس طرف سے لکھو گے وہ سچی رہے گی، پیغمبر رسم الخط کے پیچھے نہیں پڑتے، وہ اس ہاتھ کو درست کرنا چاہتے ہیں جو قلم سے کام لیتا ہے بلکہ وہ اس دل کو درست کرنا چاہتے ہیں جو ہاتھ کو حکم دیتا ہے۔

پیغمبر وسائل نہیں پیدا کرتے مقاصد عطا کرتے ہیں

پیغمبروں کا کام یہ نہیں کہ اپنے اپنے زمانہ میں نئی نئی ایجادیں کریں اور آلات اور مشینیں تیار کریں، وہ اس طرح کے انسان پیدا کرتے ہیں جو ان مصنوعات اور وسائل کو صحیح مقصد کے لئے صحیح طریقے پر استعمال کرسکیں۔ یورپ وسائل پیدا کرتا ہے پیغمبر مقاصد عطا کرتے ہیں، انہوں نے مشینیں نہیں ڈھالیں، آدمی ڈھالے تھے، یورپ نے مشینیں بنائیں مگر انہیں استعمال کون کرے؟ درندہ صفت انسان؟ آج ساری مصیبت یہ ہے کہ وسائل بہت ہیں، ایجادات بہت ہیں، سامان بہت ہے مگر صحیح طریقے پر استعمال کرنے والا آدمی نایاب ہے۔

انسانیت کو غمخوار انسانوں کی ضرورت ہے

انسانیت کو آج ایمان و یقین، سچائی اور پاکیزگی، محبت و مروت اور ہمدردی، غمخواری کی ضرورت ہے اس کا مداوا تہذیب نہیں، تحریر نہیں، اس کو ضرورت ہے غمخوار انسانوں کی، دردمند انسانوں کی، جو دوسروں کے لئے گھلیں اور اپنے کو مٹا کر دوسروں کو بنائیں، تحریروں اور تہذیبوں سے انسانیت نہیں پیدا ہوتی، یورپ نے ہم سے اخلاق اور روحانی اقدار (Values) چھین لئے، اس معاملہ میں وہ خود خالی ہاتھ تھا، اس نے ہمیں بھی دیوالیہ بنادیا، اس نے ہماری جھولیوں کو اخباروں سے بھردیا، معلومات سے بھردیا، مصنوعات سے بھردیا اس نے ہماری راتوں کو چراغوں سے جڑدیا، بجلی کی قمقموں سے جگمگادیا، ہمیں دل کی روشنی کی ضرورت تھی، اس نے دل کا چراغ گل کردیا، مبارک تھا وہ زمانہ جب دل کی روشنی تھی بجلی کی روشنی نہیں تھی، آپ خود سوچیں آپ سے کوئی سودا کرنا چاہے تو آپ کونسا زمانہ پسند ہے؟ انسانیت کا ہمدردی کا، غمخواری کا زمانہ جس میں آدمیت کی قدر اور فکر تھی، یا وہ زمانہ جس میں انسانیت کا کوئی احترام نہیں، مگر اس میں پریس ہیں، بجلی کی روشنی ہے اور برقی پنکھے ہیں، آج سکون قلب میسر نہیں لیکن پیسہ کی افراط ہے آج سب کچھ ہے لیکن روحانی قدریں عنقا ہیں، آج سب کچھ ہے لیکن مقصد نہیں جس کے حلق میں کانٹے پڑ

رہے ہوں، پیاس سے تڑپ رہا ہو، اسے چلو بھر پانی چاہیے اس کے لئے سب کچھ، کچھ نہیں، اس کے لئے اشرفیاں موجود ہوں تو کیا؟ بس تمدن میں محبت کا ذرہ نہیں، ایثار و ہمدردی کا نام نہیں، جسے دیکھو غرض کا بندہ، اس تمدن کو لے کر کیا کریں۔

ہم نے دل کا راستہ کھو دیا

ساری غلطی یہ ہو رہی ہے کہ صحیح دروازے سے آنے کی کوشش نہیں کی جاتی، چور دروازے سے داخل ہوتے ہیں، دل کا پھاٹک بند ہے اور اندر جانے کا راستہ وہی تھا، دل کا راستہ ہم کھو چکے ہم خود غرضیوں کے ساتھ وہاں نہیں پہنچ سکتے، دنیا کا بگاڑ، بیجا غرور اور خواہشات کا اقتدار اور ان سب کا دہانہ دل ہے، اس دل میں جب ایک خدا کا اقتدار نہیں اسے اسکی بالا دستی تسلیم نہیں یہ اپنے کو اس کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتا تو پھر اس کی شکایت کیا، کسی کو پھر کیا غرض ہے کہ وہ کسی کی مدد کرے اور دوسرے کے لئے اپنے کو خطرے میں ڈالے، آج کی دنیا میں بھائی بھائی کو تاجرانہ ذہن سے دیکھتا ہے، ہر ایک نے دوسرے کو گاہک اور فریق سمجھ لیا ہے، سب طرف لوٹ کھسوٹ (Exploiation) کا بازار گرم ہے، فطرت انسانی مسخ ہو گئی ہے، باپ بیٹوں سے نالاں ہیں، استاد شاگردوں سے ناخوش ہیں۔

نظام تعلیم کا نقص

آج یونیورسٹیوں میں کہرام مچا ہوا ہے کہ شاگرد ادب نہیں کرتے اور استاد شفقت و ہمدردی نہیں برتتے، تمام لوگ اس سے پریشان ہیں اور اس کی اصلاح کی طرح طرح کی کوششیں ہوتی ہیں، لیکن اس کی جڑ اور بنیاد پر غور نہیں کیا جاتا کہ تعلیمی نظام جس کا سارا ڈھانچہ مادّہ پرستی ہو۔ آخر اس کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں، تعلیم کا کون سا اسٹیج ہے، جہاں اخلاق اور کردار کی تعمیر کی کوشش کی جاتی ہے؟ یہ تمام برائیاں تو متوقع نتائج ہیں، اس نظام تعلیم کے تمہارا ادب، تمھارا آرٹ نفسانی خواہشات کو پیدا کرتا ہے، اور انسان کو موقع پرست (opportunist) بناتا ہے اور پھر تمہارا ماحول ایسے مواقع بہم پہنچاتا ہے کہ خواہشات اور خود غرضیوں کی تسکین ہو سکے، وہ تمھیں دولت مند، ساہوکار بننے کا جذبہ دیتا ہے، اس وقت ضرورت ضمیر اور ذہن بدلنے کی ہے، ان کے بدلے بغیر کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

ذہنیت کی تبدیلی کی ضرورت

آج ہمارے ملک میں کئی اصلاحی اور سماجی تحریکیں چل رہی ہیں، ہم ان کی قدر کرتے ہیں اور ہمارا بس چلے تو ہم ان کی مدد کریں، خصوصاً بھودان تحریک، لیکن زمین لینے سے پہلے دلوں میں یہ بات پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ کوئی زیادہ زمین رکھ ہی نہ سکے، لوگ خود بخود زمین دینے کو تیار ہو جائیں، ایسی ذہنیت بن جائے کہ لوگ ضرورت مندوں کو اپنی چیزیں دے کر خوشی محسوس کریں۔

ہم نے تاریخ میں یہ واقعہ پڑھا ہے کہ مکہ اور مدینہ میں پشتینی رقابت تھی، ان کے کلچر اور (social life) میں اختلاف، لیکن جب مکہ سے لوگ مدینہ آنے پر مجبور ہوئے اور انھیں اپنا سارا اثاثہ اور مال و دولت چھوڑ کر خالی ہاتھ مدینہ آنا پڑا تو جن کے پاس کچھ نہ تھا وہ مدینہ کے مالدار کھاتے پیتے لوگوں کے بھائی بنا دیئے گئے، انھوں نے اپنے ان بھائیوں کو سینے سے لگایا اور جن سے کوئی خونی رشتہ نہیں تھا، ان کے سامنے اپنے گھر کی آدھی دولت لا کر رکھ دی، ادھر آنے والوں کے دل ایسے بنائے گئے تھے اور ان کی ایسی تربیت کی گئی تھی کہ انھوں نے ان کو دعا دی اور ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہمیں آپ کچھ تھوڑا سا قرض دید یجئے اور بازار کا راستہ بتلا دیجئے ہم مکہ میں بھی تجارت کرتے تھے اور یہاں بھی تجارت کریں گے، پیغمبر اسلام نے مدینہ والوں میں ایثار و ہمدردی اور قربانی کا جذبہ بیدار کیا او ر مکہ والوں میں خود اعتمادی اور خودداری کا، انھوں نے گھر کی دولت آنے والوں کے قدموں پر ڈال دی اور آنے والوں نے دولت پر نگاہ نہ کی، اور اپنے ہاتھ پاؤں اور اپنی محنت سے کمانے کا فیصلہ کیا۔

ہمارا سر نیچا ہو جاتا ہے، جب آج کی ہجرت پر نظر ڈالتے ہیں نہ ایک طرف ایثار و ہمدردی ہے، نہ دوسری طرف خود اعتمادی اور خودداری۔

ہم کہتے ہیں کہ ذہنیت بدلئے محبت پیدا کیجئے، ایسے دل پیدا کیجئے جو دوسروں کے غم میں گھلنے کی آرزو کریں، زمین کی تقسیم سے پہلے انسان کے اندر یہ آگ پیدا کرنی تھی کہ اس سے کسی کی مصیبت نہ دیکھی جائے، کمیونزم انتظام اور اسٹیٹ سے کام لیتا ہے، مذہب دل کی کیفیت ایسی بناتا ہے کہ اشرفیاں سانپ بچھو معلوم ہونے لگیں، محمد رسول اللہ نماز کے لئے کھڑے ہوئے وہ نماز جس کے لئے آپ کہتے ہیں کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، جس کے لئے آپ بے

مطمئن رہتے تھے اور بلالؓ مؤذن سے کہتے تھے کہ اذان دو، کبھی آپ ﷺ نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں لیکن اچانک گھر میں جاتے ہیں پھر واپس آ کر نماز ادا کرتے ہیں۔ پوچھا گیا کہ آپ کو کون سا ضروری کام یاد آیا کہ نماز چھوڑ کر واپس تشریف لے گئے؟ فرمایا کہ تھوڑا سا سونا رکھا تھا، میں اسے غریبوں میں تقسیم کرنے کی ہدایت کر آیا۔

کوئی زبان غیر نہیں

میں مسلمانوں سے کہوں گا کہ ہمت بلند کرو، تمہارا کسی زبان سے بیر نہیں، تمہیں کسی زبان سے وحشت نہیں ہونی چاہیے تم نے فارسی کو اپنایا، تم ہندی کو کیوں نہ اپناؤ اسی طرح زبان جو ہمارے ملک کی زبان ہے لیکن میں اپنے ہندو بھائیوں سے کہوں گا کہ وہ خلوص دل سے سوچیں کہ انسانیت کا سدھار نہ اس زبان میں ہے نہ اس زبان میں، نہ اس کلچر میں ہے نہ اس کلچر میں، نہ اس تہذیب میں ہے نہ اس تہذیب میں، آپ انسان میں قربانی کا جذبہ نیکی کا جذبہ پیدا کیجئے، اسے انسان بنایئے، انسانیت کا احترام سکھایئے، آج انسانیت کا ضمیر (Conscience) بگڑ چکا ہے، وہ اپنی قوم اور اپنے ملک ہی کو دیکھنے کا عادی بن چکا ہے، جسے بحر اوقیانوس (Atlantic Ocean) کہتے ہیں اس سے اس طرف انسان ہی نہیں، ہر ملک کے باشندے اپنے سوا کسی کو انسان نہیں سمجھتے، ہر طرف جتھہ بندی ہے اور خود غرضی، روس کے کمیونسٹوں کے سامنے ایک طبقہ کا مفاد ہے، امریکہ کے سرمایہ داروں (Capitalists) کے سامنے دوسرے طبقے کا مفاد، ایک کو سرمایہ دار نظر نہیں آتا، ایک کو کاشتکار، ایک کے نزدیک دنیا میں مزدور ہی مزدور ہیں، دوسرے کے نزدیک کاشتکار ہی کاشتکار، تیسرے کے نزدیک سرمایہ دار ہی سرمایہ دار، یہ قوم پرستی یہ تنگ نظری بڑی خطرناک چیز ہے۔

خدا پرستی کی تحریک کی ضرورت

آج خدا پرستی اور انسانیت دوستی کی تحریک کی ضرورت ہے، آج اس کے لئے ایک زبردست مہم (Campaign) کی ضرورت ہے، ایک زلزلے کی ضرورت ہے خدا پرستی کی آندھی کی ضرورت ہے، جو بڑی بڑی خود غرضیوں کے پہاڑوں کو ہلا دے، خواہشات کے ٹیلوں کو اڑا دے، شہر شہر، گاؤں گاؤں یہ کہتا ہے کہ حیوانی زندگی باقی رکھنے کے لائق نہیں، مادہ پرستی کا درخت کھوکھلا ہو چکا ہے۔ نفس پرستی کا درخت جو دنیا پر چھایا ہوا ہے جڑیں چھوڑ چکا ہے انسانو! اپنی قدر

پہچانو، زندہ حقیقتوں سے اپنی قسمت باندھو اللہ کی زبردست طاقت سے جڑ جاؤ۔

علم واخلاق کے تعاون کی ضرورت

ہم کو وہ سنیاسیت اور جوگ مطلوب نہیں جو دنیا سے کنارہ کشی کی تعلیم دے اور اپنی جگہ غاروں اور پہاڑوں پر تلاش کرے، ہم اس روحانیت کی دعوت دیتے ہیں جو زندگی کے ساتھ چلتی ہے، بلکہ زندگی کی رہنمائی کرتی ہے، میں رجعت پسند نہیں، میں (Reaction) کا قائل نہیں انسانیت کے لئے یہ ضروری ہے اور انسانیت کا تقاضا اور اس کی مانگ ہے کہ اخلاق، علم وسائنس اور خدا پرستی مل جل کر چلیں، آج اس کا توازن بگڑ گیا، ان میں تعاون اور اعتماد (Co-Operation) نہیں رہا، سائنس ایک طرف جارہی ہے تو اخلاق ایک طرف دونوں انتہا پسند (Extremist) ہیں۔

مادہ پرستی اور روحانیت

یہی حال مادہ پرستی اور روحانیت کا ہے، ایک دنیا کو نگل لینا چاہتا ہے اسے پوجتا ہے ایک اس سے نفرت کرتا ہے اور اس سے بیزار ہے، ہم یہ کہتے ہیں کہ اسے خدا کا عطیہ سمجھ کر، اللہ کی نعمت سمجھ کر اس کے قانون کے مطابق استعمال کرو، اسے اپنا غلام سمجھو، خود اس کے غلام نہ بن جاؤ، نہ اس زندگی کی پرستش کرو، نہ اس سے نفرت کرو خدا کے سامنے اپنے کو جواب دہ سمجھو اور اس کی عدالت کے سامنے حاضر ہونے کا اور جزا وسزا کا یقین کرو، اس کے بھیجے ہوئے بے غرض اور مخلص پیغمبروں پر اعتماد کرو اور انہیں سے اس زندگی کے اصول اور ضوابط حاصل کرو، اپنے کو خدا کا بناؤ، یہ دنیا تمہاری بن جائے گی۔

یہ تقریر 27 جنوری 1954ء کی شب گورکھپور (انڈیا) کے ٹاؤن ہال میں کی گئی۔ حاضرین شہید کے تعلیم یافتہ ہندو مسلمان حضرات تھے۔

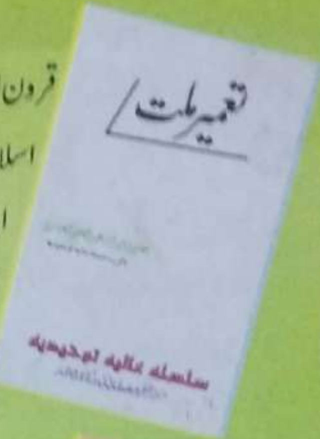
اطلاع

لیہ فتح پور کے بھائی چوہدری محمد اسلم او جلہ رضائے الٰہی سے وفات پا گئے ہیں۔ تمام بھائی ان کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں۔

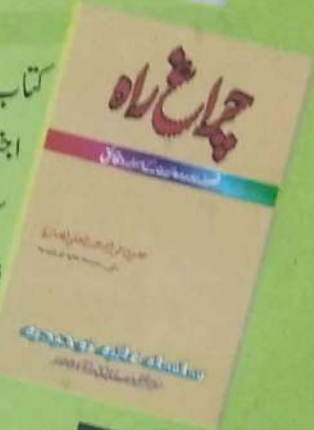
زندگی اور موت کا سوال

- جب ہمارا دین مکمل، ہمارا نبی ﷺ برحق اور ہمارا قرآن اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے تو پھر ملت اسلامیہ کے زوال کی وجہ کیا ہے؟
- جب اللہ تعالےٰ نے ہم سے وعدہ فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو تمہیں غالب رہو گے اور یہ بھی کہ اگر اللہ تمہارا مددگار ہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ تو پھر ہم اسقدر مغلوب بے بس اور رسوا کیوں ہیں؟
- مسلمان نماز بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں اور حج بھی پہلے سے زیادہ کرتے ہیں۔ بزرگوں کے مزاروں پر عرس بھی خوب شاندار طریقہ سے مناتے ہیں۔ ماہ محرم میں بھی کیا جوش وخروش ہوتا ہے۔ مالدار بھی بہت ہیں اور لاکھوں لوگ کوٹھیوں، کاروں اور کارخانوں کے مالک ہیں تو پھر یہ مردنی کیوں ہے اور یہ تنزل کیوں ہو رہا ہے؟
- ہر طاقتور ملک کی نظریں ہمارے ملکوں پر کیوں لگی ہیں اور ہر طرف خون مسلم اسقدر بے دردی اور ارزانی کے ساتھ کیوں بہایا جا رہا ہے؟
- نکبت وادبار کی موجودہ حالت سے نکلنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور کونسے لائحہ عمل پر چل کر ہم اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں

بانی سلسلہ کی دیگر تصانیف



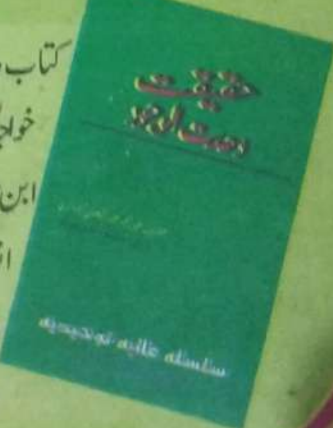
قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع
اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔



کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ
اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار، علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔



یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ
کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کردیا ہے۔ اس میں وہ تمام
اوراد واذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کردیئے ہیں جس پر عمل کرکے
کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کرسکتا ہے۔



کتاب ہذا وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مختصر مگر نہایت مدلل اور اہم دستاویز ہے
خواجہؒ صاحب نے ذاتی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کیا
ابن عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وحدت شہود میں فرق۔
انسان کی بقا اور ترقی کیلئے مذہب کیوں ناگزیر ہے۔
وہ بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا۔
روحانی سلوک کے دوران تمام بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔